عالمی اردو ادب سیریز

انتظار حسین

چاند گہن
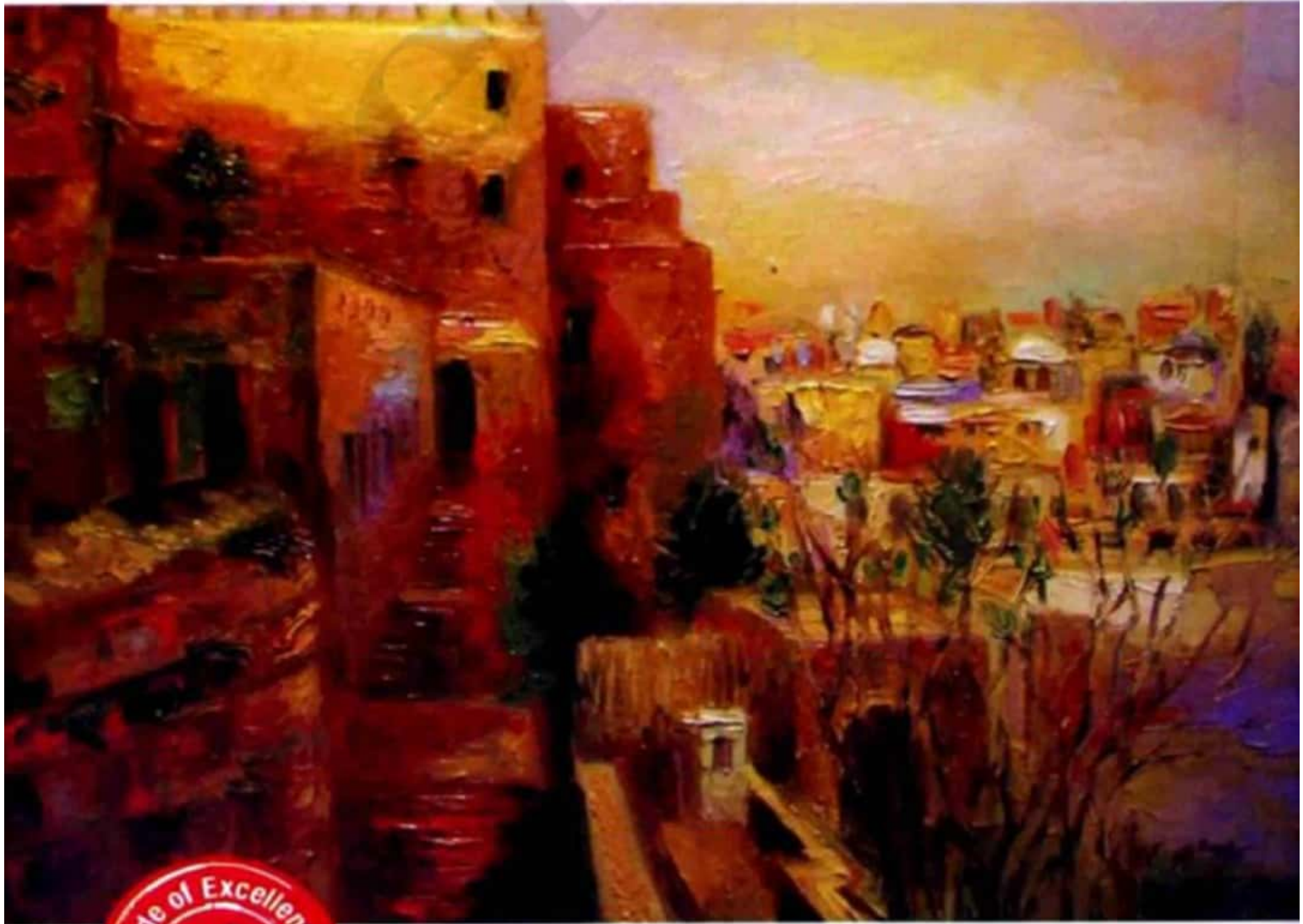
چاند گہن

انتظار حسین

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

Chand-Gehan
by Intizar Hussain
Edition : 2013
Rs.: 200/-

©انتظار حسین

نام کتاب : چاند گہن
مصنف : انتظار حسین
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز

ملنے کے پتے
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۶
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۴
- راعی بک ڈپو، الٰہ آباد۔ 09889742811
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi -110095 (INDIA)
Mob: 9971775969, 9899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.

تمھارے بڑے بوڑھوں کو خواب دکھائی دیں گے اور تمھارے جوانوں کو سائے پریشان کریں گے......اور میں آسمانوں اور زمین پہ انوکھی قدرتیں ظاہر کروں گا۔ خون اور آگ اور دھوئیں کے ستون! سورج پہ سیاہی چھا جائے گی اور چاند خون کی بوٹی بن جائے گا۔

— یوایل نبی کی کتاب

پہاڑوں میں ایک ہجوم کی آواز ہے۔ ایک بڑے لشکر کا شور۔ یہ مملکتوں اور قوموں کے دنگے کا شور ہے۔ اب تم واویلا کرو کہ خداوند کا دن نزدیک ہے۔ وہ قادر مطلق کی طرف سے ایک قیامت بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ سارے کے سارے ہاتھ ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ ہر شخص کا زہرہ آب ہو جائے گا۔ لوگ ہراساں ہوں گے اور اندوہ و جانکنی انھیں اپنے شکنجہ میں لے لے گی۔ ان کے ایسی اینٹھن ہوگی جیسے حاملہ عورت کے درد ہوتے ہیں۔ حیران و پریشان وہ ایک دوسرے کا منہ تکیں گے اور ان کی صورتیں آگ بھبھوکا ہو جائیں گی۔ آسمان کے ستارے اور سیارے بے نور ہو جائیں گے۔ سورج طلوع ہوتے ہوتے اندھیرے میں ڈوب جائے گا اور چاند اندھا ہو جائے گا۔

— یعیاہ

(1)

بو جی سوتے سوتے چونک اٹھیں۔ پہلے تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔ پھر ایسا سنائی دیا جیسے کوئی کسی کے رونے کی نقل اتار رہا ہے۔ بو جی دم سادھے پڑی رہیں۔ انھوں نے کئی مرتبہ کروٹ لینے کی نیت باندھی لیکن ارادے کے باوجود انھیں اپنے جسم کو جنبش دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ انھوں نے گردن کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی گردن پر کوئی چیونٹی بہت آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے۔ وہ گردن کھجانا چاہتی تھیں لیکن ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی۔ ان کا جسم لکڑی بن گیا تھا۔ انھیں یوں لگ رہا تھا کہ ان کی ساری رگیں ایکا ایکی سُن ہو گئی ہیں اور ان کے بدن کو کسی نے شکنجہ میں کس دیا ہے۔ وہ ہلنا چاہتی تھیں اور ہل نہیں سکتی تھیں۔ البتہ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم سُن تھا اور دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور کان ان بے نام پراسرار آوازوں کو گرفت کرنے میں مصروف تھے جن کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ پھر ایکا ایکی درخت کے پتے اک ذرا کھڑکھڑائے اور ایک پرندے

کے اڑنے کی آواز پیدا ہوئی جو دور ہوتی گئی، دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بالکل معدوم ہوگئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ بو.جی بہت دیر تک دم بند کئے آنکھیں میچے لیٹی رہیں۔ اس وقت اگر کوئی چراغ لے کر انھیں دیکھتا تو عجب حالت میں پاتا۔ چہرے کا رنگ پیلا ہلدی پڑ گیا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ گویا ان کی روح قبض ہوگئی ہے اور خالی جسم کا ڈھانچہ پڑا ہے جس میں ملک الموت کی کسی چوک کی وجہ سے ایک دھڑکتا تھرّاتا دل پڑا رہ گیا ہے۔ بری دیر کے بعد ان کی ذرا جان میں جان آئی۔ ہمت کر کے انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ پیپل کا درخت سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے پتے ایسے گھنے نہیں تھے۔ پھر بھی انھیں یہ وہم ہوا کہ کوئی ان میں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ 'کوئی' کون ہوسکتا ہے۔ کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق، یہ ان کی سمجھ میں تو اس وقت آتا جب وہ سمجھنے پہ مائل ہوتیں۔ بس انھیں تو کسی کی موجودگی کا ایک مبہم سا احساس تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھیں یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کی ہر شاخ میں کوئی چھپا بیٹھا ہے اور انھیں جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ بار بار سر نکال کر انھیں دیکھتا ہے اور پھر جلدی سے پتوں کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ دو مرتبہ تو انھوں نے واقعی ایک کالے سے سر کو تیزی سے پتوں کی اوٹ میں گم ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وسوسوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ ہزاروں طرح کے گمان اور سینکڑوں قسم کے وہم ان کے اندر گھڑ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ الٹے ہاتھ پر کروٹ لئے پڑی تھیں اور سبطین کی چارپائی ان کے سیدھے ہاتھ پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس چارپائی کے قریب کیا ہو رہا ہے۔ چارپائی کے سرہانے کوئی چیز رینگ رہی تھی۔ اس کا کوئی جسم نہیں تھا۔ کوئی شکل وصورت نہیں تھی۔ بس ایک سیاہ سایہ تھا جو آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سائے نے واقعی ایک جسم کی شکل اختیار کر لی۔ مگر یہ ایک

بے شکل جسم تھا۔ اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس میں پیچ وخم نہیں تھے۔ بس ایک ٹھوس جسم تھا اور یہ جسم سبطین پر جھکا جا رہا تھا۔ بو جی نے گھبرا کر ایک ساتھ کروٹ بدلی۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سبطین بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کی اطمینان کی نیند کو دیکھ کر بو جی کی گھبراہٹ اک ذرا کم ہوئی۔ اجلا سفید بستر، پھولوں سے کڑھا ہوا سفید نرم تکیہ سبطین اطمینان سے سو رہا تھا۔ ایک سفید چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ اس سفید بستر اور سفید چادر کو دیکھ کر بو جی کا تصور پھر بے لگام ہو گیا اور سبطین کی چارپائی کی شکل بدلنی شروع ہو گئی لیکن انھوں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ محض ایک دل دہلانے والے واہمہ سے بچنے کی خاطر انھوں نے سبطین کی چارپائی سے رخ پھیر کر گلشن کی چارپائی پر نظریں مرکوز کر دیں۔ گلشن کی چارپائی ان کی پائنتی کی سمت میں بچھی ہوئی تھی۔ عجب قماش کی عورت تھی۔ سوتے جاگتے یکساں غل مچاتی تھی۔ پھر بھی اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ بو جی اس کے حلق کی داروغہ بن گئی ہیں۔ زبان ہلانے نہیں دیتیں۔ اس وقت وہ بڑے زور شور سے خراٹے لے رہی تھی۔ خرخر کی آواز سے سارا صحن گونج رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے آواز نے یکایک پلٹا کھایا اور 'فٹ' کی آواز پیدا ہوئی۔ بس یوں معلوم ہوا کہ چلتی گاڑی میں کسی نے یکایک بریک لگا دیے ہیں اور وہ ایک دھچکے کے ساتھ رک کر کھڑی ہو گئی ہ اور جس طرح ریل گاڑی کے رک جانے پر اسٹیم کی آواز نکلا کرتی ہے، کچھ اسی قسم کی آواز گلشن کے منھ سے نکل رہی تھی۔ اس کا منھ کھلا ہوا تھا اور سوں سوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا تیزی سے منھ میں داخل ہوتی ہے اور کسی وجہ سے پریشان ہو کر تیزی سے نتھنوں کے راستے نکل آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عبوری کیفیت ختم ہوئی اور خراٹوں کی آواز پھر باقاعدگی سے بلند ہونے لگی۔ البتہ اس مرتبہ آواز میں کچھ ٹھہراؤ تھا۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ

محض ایسا ٹھہراؤ ہے جو ہر عمل کے آغاز میں ہوا کرتا ہے۔ اس کی تان بالعموم اسی نقطہ پر جا کر ٹوٹے گی جس نقطہ پر پہلے جا کر ٹوٹی تھی۔ اتنے میں گھڑونچی پر کچھ کھٹکا ہوا۔ گھڑے کا ڈھکن زمین پر گرا اور کوئی چیز دھم سے نیچے کو دی۔ بو جی نے ہڑ بڑا کر گھڑونچی کی طرف دیکھا۔ ایک بلی بڑے مضمحل سے انداز میں ٹہلتی ہوئی سبطین کی چارپائی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بو جی اسے زور سے ڈانٹنا چاہتی تھیں لیکن ان کی آواز بھنچ کر رہ گئی۔ ان کی زبان سے ایک دبی سی آواز نکلی "ملتی" اور بلی سٹاک سے موری میں گھس گئی۔

بو جی پر یہ کیفیت جانے کب تک طاری رہی۔ وہ تو اس وقت چونکیں جب مرغے نے دڑبے کے اندر اپنے پر پھڑ پھڑا کر زور سے ککڑوں کوں کی آواز بلند کی۔ مرغے کی اذان نے پورے دڑبے میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ مرغیوں کی کٹ کٹ اور پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کے مدھم شور کو سن کر کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سیال چیز ابھرتی چلی جا رہی ہے اور تھوڑی دیر میں دڑبے کی چھت چٹخے گی اور یہ سیال متحرک مادہ یوں ابل پڑے گا جیسے حضرت نوح کے زمانے میں طوفان کا پانی تنور سے ابل پڑا تھا۔ کابک کے ایک دو خانوں سے بھی اس قسم کا بہت دھیما سا شور سنائی دیا تھا۔ اس شور میں ننھے منے جھانجھنوں اور گھنگھروؤں کی لطیف سی جھنکار بھی ملی ہوئی تھی۔ ایک کانے سے یا غفور یا غفور کی صدائیں آ رہی تھی جیسے گائے کا دودھ دوہتے وقت ایک لطیف سی آواز کے ساتھ سفید سفید جھاگ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ مرغ کی اذان کا اثر تھا یا اس وجدان کا جو قدرت کی طرف سے مرغوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں کو بھی عطا ہوا ہے۔ پھر جب دور کی کسی سڑک پر اِکّے کے چلنے اور پیپل کے نیچے والے کوئیں میں ڈول پڑنے کی آواز آئی تو بو جی کو یقین ہو گیا کہ دن

کے ہنگاموں کا آغاز ہو چلا ہے۔

حوائج ضروری سے فراغت پا کر انھوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔صبح کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے لیکن دعا بالعموم طویل ہو جاتی ہے۔بو جی کی دعا میں مدعا تو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا لیکن وہ واسطے اتنے نبیوں، ولیوں اور اماموں کے دیتی تھیں کہ دعا خواہ مخواہ طویل ہو جاتی تھی۔اور ااج تو انھوں نے حد ہی کر دی۔سجدے میں جانے کتنی دیر پڑی رہیں اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہیں۔ انھوں نے شاید سجدے میں ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔لیکن وہ تو یہ کہئے کہ انھوں نے گلشن کی آہٹ سن لی اور انھیں محض اس منحوس راز کے اظہار کے لئے سجدے کی لذت سے کنارہ کرنا پڑا جس نے ان کے سینے میں کلبلی مچا رکھی تھی۔انھوں نے سر اٹھایا اور جانماز کو لپیٹتے ہوئے کہنے لگیں۔۔۔ ''اری گلشن! تو نے سنی تھی آواز؟'' اور یہ کہتے کہتے ان کا روئے سخن گلشن کی بجائے آسمان کی طرف ہو گیا، ''الٰہی میرے بچے پہ رحم کیجیو۔میں بڑی گنہگار ہوں... بارالہا...'' گلشن بو جی کی بات اکثر ٹال بھی دیا کرتی تھی۔لیکن اس وقت تو ان کے چہرے پہ ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ اسے بھی سنجیدہ ہو جانا ہی پڑا۔اس نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ معاملہ کچھ بہت زیادہ سنگین ہے۔لیکن وہ اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھی اور کوئی ہوتا تو پٹ سے پوچھ لیتا، ''بو جی کیسی آواز؟'' لیکن اس قسم کے سنگین واقعات سے اپنی لاعلمی ظاہر کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ آخر بو جی خود ہی کھل گئیں۔۔۔

''اری پہلے تو میں یہ سمجھی کہ اڑوس پڑوس میں کوئی ہنستا ہوگا مگر میرا ماتھا ٹھنک گیا۔مگر جب اس نے رونے کی نقل اتاری تو میرا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔نا بی بی اس محلّہ مین رہنا ٹھیک نئیں ہے۔اللہ ہر بلا سے بچائے رکھے۔جانے کیا ناگہانی

آفت آنے والی ہے۔''

گلشن تو اشارے کو بھی سمجھتی تھی چل نکلی۔۔ ''اجی بو جی میں سمجھی کہ خواب دیکھ رئی اوں۔ میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ پٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یوں سمجھا کہ پڑوس میں کسی کا بچہ رووے ہے۔ اجی یہ کمبخت جانور تو بڑا منحوس ہووے ہے۔ جس شہر میں بولا ہم نے یونہی سنا کہ وہ شہر اوجڑ.....''

''اری چپ رہ گلشن۔ نا بی بی اس گھر میں ایسا لفظ زبان سے مت نکالو۔''

بو جی خود غیر ارادی طور پر ایسے بدشگونی کے الفاظ ضرور کہہ جاتی تھیں لیکن کسی دوسرے کو انھوں نے بری آواز نکالنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

دراصل بو جی کا ماتھا تو اسی روز ٹھنکا تھا جب ان کی جوتی پہ جوتی سوار ہو گئی تھی۔ آنکھوں دیکھتے تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ گلشن اس کھلی ہوئی حقیقت کی تردید بھلا کیسے کر دیتی۔ وہ ان کی تشفی کے لئے صرف اس قدر کہہ سکی۔۔ ''اجی بو جی سفر تو سبوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بس اوپر والے سے یہ دعا کرو کہ وہ جو کرے اچھا کرے۔'' بو جی نے اس تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھا اور چپ ہو رہیں۔ لیکن جب انھوں نے آسمان پہ دُمدار ستارہ دیکھا ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ یہ بات ان کی اماں جان نے اپنی خالہ بی سے سنی تھی کہ جب ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا تھا تو اس سے ایک مہینہ پہلے آسمان پہ روز شام کو دُمدار ستارہ دکھائی دیتا تھا اور ۱۹۱۴ء کی جنگ تو خود انھیں بھی اچھی طرح یاد تھی۔ انھوں نے اس زمانے میں خود اپنی آنکھ سے متواتر سات دن تک آسمان پر دُمدار ستارہ دیکھا تھا اور اس کے بعد انگریز اور جرمن میں وہ خون خچر ہوا کہ خدا کی پناہ۔ البتہ ستارے ٹوٹنے کی روایت صرف غدر سے مخصوص تھی۔ یہ روایت بھی انھوں نے اپنی اماں جان ہی سے سنی تھی۔ اب جب انھوں نے ایک رات کو

تابڑتوڑ تین ستارے ٹوٹتے دیکھے تو انھیں بے ساختہ یہ روایت یاد آ گئی اور بولیں— ''اللہ اپنا رحم کرے تارے بہت ٹوٹ رہے ہیں۔'' گلشن نے جب اس تلمیح کی توضیح طلب کی تو انھوں نے بڑے عالمانہ انداز میں اس کی تفسیر یوں کی تھی کہ جب دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہونے کو ہوتا ہے تو اللہ میاں اپنے فرشتوں سے مشورہ کرتے ہیں۔ شیطان کنسوئیاں لینے آتا ہے۔ بس اس وقت پہرے والا فرشتہ اس کے پیچھے گرز لے کر دوڑتا ہے۔ یہ ستارہ جب ٹوٹتا ہے تو دراصل یہ گرز ہوتا ہے جو شیطان کے سر پہ پڑتا ہے۔ یوں کام کاج کے سلسلہ میں جب بو جی گلشن کو الزام دیتی تھیں تو گلشن ضرور ان کی تردید کرتی تھی اور کبھی کبھی نوکری چھوڑنے کی دھمکی بھی دے ڈالتی تھی، لیکن اس قسم کے الٰہیاتی مسائل میں تو وہ جھٹ ان پر ایمان لے آتی تھی۔ الو کے بولنے کے سلسلہ میں وہ بو جی پر صرف ایمان ہی نہیں لائی بلکہ کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آپ کو یہ یقین بھی دلا لیا کہ اس نے خود بھی وہ آواز سنی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نیند کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس پر دھیان نہیں دے سکی تھی۔ بہر حال وہ سبطین سے لاکھ درجہ اچھی تھی جو بو جی کی کوکھ سے نکلا تھا اور اس کے باوجود ان کی کسی بات کا یقین نہیں کرتا تھا اور ان کے اشارے کنائے سمجھنے کی تو اس میں سرے سے اہلیت ہی نہیں تھی۔ بو جی اپنے آباد گھر میں ایسے منحوس جانور کا نام کیسے لے سکتی تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھیں کہ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کر دیتیں لیکن اگر سبطین کے دماغ میں گوبر بھرا ہو تو اس کا کیا علاج تھا۔ آخر گلشن نے تھوڑی سی ہمت سے کام لیا اور اس کا نام لینے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن ابھی وہ 'الف' اور 'ل' کی آوازیں ہی نکالنے پائی تھی کہ بو جی نے اسے ڈانٹ دیا— ''اری لچی کمبختی ماری تیری زبان کو لقوا مارے چپکی رہ۔ تو بڑی آئی بھرے گھر میں اس کا نام لینے والی۔'' لیکن خیر گلشن کا مقصد تو پورا ہو ہی گیا۔ یہ الگ بات

ہے کہ سبطین نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے الٹا غریب بو جی کو لتاڑ دیا۔ ''بو جی تم تو بالکل سٹھیا گئی ہو۔ بالکل دقیانوسی باتیں کرتی ہو۔''

— ● — ● —

بو جی واقعی دقیانوسی باتیں کرتی تھیں۔ 'مجھے شک آوے ہے' کا فقرہ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ہر بات میں شک، ہر کام میں شک۔ پتہ کھڑکا اور ان کے کان کھڑے ہوئے، الٹی آنکھ پھڑکی اور ان کا دل دھڑکا، ہچکیاں آنی شروع ہوتی تھیں تو یقین کر لیتی تھیں کہ انھیں کوئی یاد کر رہا ہے۔ اگر کہیں زبان کٹ جاتی تو فوراً گمان گزرتا کہ کوئی ان کی غیبت کر رہا ہے۔ جانور ان کے لئے جانور نہیں بلکہ نیکی اور بدی کے نمائندے تھے۔ کسی سے نیک شگن لیتی تھیں، کسی کو بد فال سمجھتی تھیں اور کسی کو نجاست کی پوٹ تصور کرتی تھیں۔ مرغیاں تو خیر انھوں نے انڈوں کے شوق میں پال رکھی تھیں لیکن کبوتر پالنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ گھر میں فرشتوں اور نیک روحوں کی آمد و رفت رہے۔ سبطین نے جب کتا پالنے کی نیت باندھی تھی تو اس کی اجازت انھوں نے صرف اس بنا پر نہیں دی کہ جس گھر میں کتا رہتا ہے وہاں فرشتے قدم نہیں رکھتے۔ اس بات کا وہ خاص طور پر اہتمام رکھتی تھیں کہ جمعرات کی شام کو کالی بلی یا کالے کتے پر ان کی نظر نہ پڑے۔ صبح کے سلسلہ میں یہ اہتمام بندر کے لئے کیا گیا تھا۔ بو جی کا تجربہ یہی بتاتا تھا کہ جب کبھی صبح آنکھ کھلتے ہی بندر نظر آ گیا سارا دن پریشانی میں گزرا۔ سانپ کو زمین کا اور شیر کو جنگل کا بادشاہ سمجھتی تھیں۔ سانپ کے لئے انھوں نے ایک آیت یاد کر رکھی تھی جس کے اثر سے سانپ اپنی جگہ پر جما کا جما رہ جاتا

تھا اور جنگل کے بادشاہ کا علاج تو خیر سلمانؓ فارسی نے بتا ہی رکھا تھا۔ نادِعلی اتنی لمبی چوڑی عبارت تو نہ تھی کہ بو جی کو حفظ نہ ہوتی۔ بو جی گرگٹ کو مارنا ثواب سمجھتی تھیں۔ اگرچہ یہ فرض گلشن یا پھر رفیا مردانے سے آکر انجام دیتا تھا لیکن بو جی یہی سمجھتی تھیں کہ پلی بھر خون ان کا بڑھا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے مرجھا کر منقی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ آندھی ان کے لئے آندھی نہیں بلکہ ستر بلاؤں کا جلوس ہوتی تھی۔ کالی آندھی چلتی تھی تو سمجھ لیتی تھیں کہ شاہِ جنات کی سواری نکل رہی ہے۔ زلزلہ آتا تو سمجھتیں کہ گائے نے سینگ بدلا ہے، اس کی وجہ سے زمین ہل رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین ایک گائے کے سینگوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ گہن سورج کو لگتا یا چاند کو انھیں صدقہ دینا ضرور تھا۔ صدقے کے علاوہ وہ رفع بلا کی نیت سے دو رکعت نماز بھی بجالاتی تھیں اور گڑگڑا کر دعا مانگتی تھیں کہ ''الٰہی تجھے اپنے حبیب کا واسطہ چاند پہ جو وقت آن پڑا ہے، اسے ٹال دے۔'' مختصر یہ کہ بو جی کا تصور یہ تھا کہ فطرت کے سارے مظاہر نے غریب انسان کے خلاف لام بندی کر رکھی ہے۔ قصبے کے ایک چوتھائی سے زیادہ مکانوں کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہاں پلید روحیں رہتی ہیں۔ نکڑ شاہ کے احاطہ میں تو سب کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہاں پیر جی نکڑ شاہ کا مزار تھا۔ ایک روز جب وہ وہاں چڑھاوا چڑھانے گئی تھیں تو انھوں نے قبر کے تعویذ میں تازہ تازہ چنبیلی کے پھول رکھے ہوئے دیکھے۔ بو جی کو تعجب تو اس پر تھا کہ چنبیلی کا موسم نہیں، یہ پھول کہاں سے آ گئے پھر بقول ان کے ان پھولوں کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ ان کا سارا دماغ خوشبو سے بس گیا۔ پھر ایک جمعرات کی شام کو انھوں نے دیکھا کہ ایک سفید نورانی سایہ ہے جو بلند ہوتا جاتا ہے۔ لحد کے قریب پہنچ کر وہ غائب ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی پلید روح نہیں ہو سکتی تھی۔ پلید روحیں اتنی سفید نورانی بھلا کہاں ہوتی ہیں۔

بو جی نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ خود پیر جی نکڑ شاہ تھے پاک روحوں سے بھلا کون ڈرتا ہے اس کی وجہ پاسِ ادب سمجھئے کہ بو جی پھر اس طرف کبھی نہیں گئیں۔ ہاں انھوں نے یہ التزام ضرور برتا کہ ہر جمعرات کی شام کو وہ پانچ پیسے کے پیڑے منگا کر گلشن کے حوالے کرتی تھیں اور گلشن بڑی دیانت داری سے پیڑوں کا دونا نکڑ شاہ کے مزار پر رکھ آتی تھی۔ بو جی خود بھی بڑی دیانت دار اور سمجھ دار تھیں۔ جب لوگوں میں یہ چرچا ہوا کہ نکڑ شاہ کے مزار پر ہر جمعرات کی شام کو تازہ تازہ پیڑے رکھے ملتے ہیں تو انھیں بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خود بھی ہر جمعرات کی شام کو پیڑوں کا دونا وہاں بھجواتی ہیں۔ یہ خیال انھیں آ بھی کیسے سکتا تھا، ان پیڑوں کو جنھوں نے چکھا تھا وہ کہتے تھے کہ ان پیڑوں کا مزہ کچھ بہت ہی عجیب سا ہوتا تھا گویا جنت کا کوئی میوہ کھا رہے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی پیر جی نکڑ شاہ کے طفیل لوگوں کو جنت کے میووں کے مزے کا تو پتہ چل ہی گیا۔

دراصل بو جی وقت کے بہت بعد پیدا ہوئی تھیں۔ وہ پیدا کسی زمانے میں بھی ہوتیں انھیں مر جانا چاہیے تھا ۱۹۲۰ء سے پہلے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کی حقیقتوں کو انھوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان کے لئے دنیا کی تاریخ ۱۸۵۷ء کے غدر سے شروع ہوتی تھی اور ۱۹۱۴ء کی جنگ پر ختم ہو جاتی تھی۔ یوں ان کے ذہن میں ۱۹۵۷ء سے پہلے کی تاریخ کا بھی ایک تصور موجود تھا۔ اس میں کچھ پرستان کے قصے شامل تھے، کچھ عالم بالا کی واردات، کچھ عرب کے واقعات۔ اور یہ سب کچھ مل کر تاریخ تو نہیں تاریخ کا ایک ملغوبہ سا بن گیا تھا۔ بہر حال یہ تو ماضی کی تاریخ تھی۔ حاضر ان کے لئے غدر سے شروع ہو کر پہلی جنگ عظیم پر ختم ہو جاتا تھا اور اس سے آگے بس ایک خلا تھا۔ بازار سے دوپٹوں کی ململ غائب ہو جانے اور گیہوں کا توڑا پڑ جانے کی وجہ سے انھیں

دوسری جنگ عظیم کا پتہ تو چل گیا تھا۔ لیکن انھوں نے اسے ایک بڑے واقعہ کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ایک خوفناک قحط کا حال بھی اکثر ان کی زبان سے سنا گیا ہے۔ یہ قحط بھی ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان کسی زمانے میں پڑا تھا۔ بنگال کے قحط کا علم تو انھیں ضرور ہو گیا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے ان کے تخیل میں ہنگامہ پیدا نہیں کیا تو یہ قصور واقعہ کا ہوا نہ کہ بو جی کے تخیل کا۔ بنگال کے سلسلہ میں وہ بس ایک ہی اصطلاح سے واقف تھیں... بنگال کا جادو۔ 'بنگال کے کال' کی اصطلاح نے ان کے تخیل کے لئے مطلق غذا فراہم نہیں کی۔ بو جی کے دماغ میں شاید یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جتنے ہنگامہ خیز واقعے ہونے تھے وہ ۱۹۱۴ء سے پہلے ہو چکے۔ اس کے بعد تو زندگی بس گھسٹ گھسٹ کر اپنے دن پورے کر رہی ہے۔ البتہ مستقبل کے متعلق انھیں ضرور دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی ہنگامہ خیز واقعہ نہ ہو جائے۔ شاید اسی لئے وہ اس مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں کہ کہیں کوئی ایسی علامت تو ظاہر نہیں ہوئی ہے جو غدر یا جنگ عظیم سے پہلے ظاہر ہوئی تھی۔ جنگ عظیم سے تو نہیں لیکن غدر سے ضرور چند تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بو جی کے والد واقعی اللہ کے جی تھے اگر انھیں تھوڑی سی بھی عقل ہوتی تو آج ان کی بیٹی کسی ریاست کی رانی ہوتی۔ بو جی نے ہر آنے جانے والے کو یہ بات بتا رکھی تھی کہ غدر کے زمانے میں دلّی کے مغل بادشاہ نے ان کے بڑے ابا کی خدمات سے خوش ہو کر انھیں ایک پروانہ لکھ دیا تھا۔ مگر جب دلّی میں بھگدڑ مچی تو وہ بھی وہاں سے پیدل چل پڑے۔ پروانہ نیفے میں اُڑس کر ایسے بے خبر ہوئے کہ تین دن بعد انھیں پتہ چلا کہ پروانہ کہیں رستے میں گر پڑا ہے۔ بو جی کو یقین تھا کہ اس پروانے میں مغل بادشاہ نے کوئی بڑی سی ریاست بڑے ابا کے نام لکھ دی تھی۔

بڑے ابا تو خیر تھے ہی اللہ کے جی مگر سبطین کے ابا جان بھی کچھ کم نہ تھے۔ وہ

خسر سے بھی چار جوتے بڑھے ہوئے نکلے۔ مغل بادشاہ جتنا بڑے ابا پہ مہربان تھا اتنا ہی انگریز ابا جان سے خوش تھا۔ اگر انھیں اولاد کا ذرا بھی خیال ہوتا تو آج الغاروں پیسہ ہوتا۔ سبطین سونے میں تلتا اور بو جی رانی بنی راج کرتیں۔ مگر توبہ کیجئے۔ وہ تو ایمانداری کی ٹر میں مرے جاتے تھے۔ روپیوں کی بوریاں کی بوریاں لے کر سرحد جاتے تھے اور پٹھانوں میں بانٹتے تھے۔ کبھی ایک پائی کی بے ایمانی نہیں کی۔ انگریز ان کی وفاداری اور ایمانداری سے بہت خوش تھا۔ لیکن تھا نرا خشکا۔ تنخواہ ونخواہ تو بڑھائی نہیں خالی خطاب دے کر ٹرخا دیا۔ سبطین کے ابا جان اسی میں خوش تھے۔ مرے تو سارے خطابات سینے پہ دھر کے لے گئے اور جائیداد کے نام بس ایک مکان، آٹھ دس دکانیں، بیس تیس بیگھہ زمین اور ساٹھ پینسٹھ ہزار کا بینک کا حساب چھوڑا۔ بو جی نے اس پر بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک یتیم اور بیوہ کے لئے روکھی سوکھی روٹیوں کا سہارا تو ہو ہی گیا۔

بو جی نے اپنے یتیم بچے سے بڑی امیدیں باندھی تھیں۔ لیکن اس نے بڑے ہو کر وہ گل کھلائے کہ ان کے سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ بڑے بوڑھے اسی لئے ہوا کرتے ہیں کہ نوجوان انھیں دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ باپ دادا کی غلطیوں سے جو شخص سبق نہ سیکھے اس سے زیادہ بے وقوف کون۔ لیکن بو جی سچ کہتی تھیں کہ ''کسی کا ایک بگڑتا ہوگا دو بگڑتے ہوں گے، ہمارا تو آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔'' سبطین نے تو وہ مثل سچ کر دکھائی کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ لیکن سبطین کے باپ اور نانا نے دولت نہ کمائی ہو نام تو ضرور پیدا کیا تھا۔ سرکار دربار میں ان کی وہ پوچھ تھی کہ کیا کسی کی ہوگی۔ اور ابا جان نے تو روپیہ کمانے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی ورنہ دولت تو ان کی ٹھوکروں سے لگی پڑی تھی۔ انھیں نام پیدا کرنے کی آرزو تھی سو نام

خوب پیدا کیا۔ وائسرائے کے برابر کرسی ملتی تھی۔ خطابات کی ایک پوری قطار نام کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھی۔ انگریز نے اتنا بڑا عہدہ پہلی مرتبہ ایک مسلمان کو دیا تھا۔ آج تک لوگ ان کے مرتبہ اور عزت کو یاد کرتے تھے۔ مگر سبطین اس سے بھی گیا۔ کمانے کھٹانے کی تو خیر اس میں اہلیت ہی نہ تھی، مگر باپ اور نانا دونوں سے زیادہ تعلیم پائی تھی۔ نام تو ضرور پیدا کر سکتا تھا، ڈوب یہ پڑ گئی کہ اس نے اپنے آپ کو بھی بدنام کیا اور خاندان کا نام بھی ڈبویا۔ پوت کے پیر پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ سبطین نے دراصل کالج میں ہی ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیے تھے۔ جب قسمت بگڑنے پہ آتی ہے تو سو طرح کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ کالج میں سبطین کی فیاض خاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ سبطین کچھ خود بگڑا ہوا تھا، کچھ فیاض خاں نے اسے بگاڑا۔ بلکہ بو جی تو سارا الزام فیاض کاں ہی کو دیتی تھیں اور سبطین کو بالکل بے قصور بتاتی تھیں۔ مگر فیاض خاں کے والدین کی روایت یہ تھی کہ فیاض گھر سے اچھا کاصا گیا تھا۔ کالج میں جا کر اسے آوارہ لونڈوں کی صحبت ملی، بگڑ گیا۔ بو جی کی بھی زیادتی تھی اور فیاض خاں کے والدین بھی غضب کرتے تھے۔ دراصل کوئی کسی کو نہیں بگاڑتا۔ بگڑنے والے خود ہی بگڑ جاتے ہیں۔ جنہیں بگڑنا ہوتا ہے انھیں بھونرے میں پالئے تو بھی کسی نہ کسی طرح بگڑ ہی جاتے ہیں۔ جن کی سنبھلی ہوئی طبیعت ہوتی ہے وہ آواروں اور بدمعاشوں میں رہتے ہیں اور کندن بن کر نکلتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ سبطین جیسا خود تھا ویسا ہی اس نے ساتھی تلاش کیا۔ فیاض خاں کی بھی کالج میں کسی اور سے نہ بنی۔ سبطین سے ہفتے بھر کے اندر وہ یوں گھل مل گیا گویا اس سے دوستی گانٹھنے کے لئے ہی وہ اس کالج میں آیا تھا۔ دونوں کو سلیقہ سے بگڑنا تھا اور اس کے لئے دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔

سبطین اور فیاض خاں دونوں نرے جنونی تھے۔ جس بات کی دھت لگتی تھی ایک ہی سی لگتی تھی۔ آوارہ گردی پر آتے تو دن دن بھر اور رات رات بھر گھومتے اور سیر نہ ہوتے ہفتوں، مہینوں زمین کا گز بنے رہتے اور ہر اچھی بری جگہ پہنچتے اور شرمناک سے شرمناک اور شریفانہ سے شریفانہ حرکت کرتے۔ جب پڑھنے پر آتے تو ہفتوں ہوسٹل کے کمرے میں بند پڑے رہتے۔ رات رات بھر بجلی جلتی اور کتابوں کی ورق گردانی ہوتی۔ یہ کمرہ کیا تھا، کتابوں کا اچھا خاصا گودام تھا۔ چارپائی کا کوئی پایہ اونچا نیچا ہو جاتا تو بھی کتاب ہی کام میں لائی جاتی اور بستر پر تکیہ نہ ہوتا تو بھی غریب کتابوں پر ہی آفت ٹوٹتی۔ سبطین اور فیاض خاں کمرے سے اکثر غائب رہتے تھے۔ لیکن کمرے میں تالا پڑا ہوا کبھی نہیں پایا گیا۔ بزعم خود وہ اپنے کالج میں قلندری کی روایت قائم کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ جو چیز ضائع ہونی ہے وہ بہر صورت جائے گی۔ تالا ڈالنا محض الجھیڑا ہے۔ لیکن ان کے کمرے میں رکھا کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔ حجامت کا ٹوٹا پھوٹا سامان، موٹے چھوٹے کپڑے، ردّی کاغذ، کتابوں کا انبار، ان چیزوں کے لئے بھلا کون چوری کی مصیبت مول لیتا۔ سبطین اور فیاض خاں دونوں کی فکر زندگی کا آغاز الحاد اور بڑھی ہوئی حجامتوں سے ہوا تھا۔ جب ان کے گھروں پر یہ خبر پہنچی تو گھر والوں نے سر پیٹ لیا۔ بو جی اس دن کو روتی تھیں جب انھوں نے لونڈے کو کالج بھیجا تھا۔ لیکن کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب وہ واپس تو نہیں آ سکتا تھا۔ بو جی بہت روئیں دھوئیں، آخر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ پہلے تو انھوں نے بیٹے کے عیب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر ایسی بات کہیں چھپی رہتی ہے۔ خیالات کا پتہ لگنے میں تو خیر دیر لگتی ہے مگر بڑھی ہوئی حجامت تو دور سے نظر آتی ہے۔ جس نے بھی سبطین کے بال بڑھے ہوئے دیکھے انگلی اٹھائی اور آخر کار یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا

کہ سبطین اور سبطین کا دوست دونوں مذہب سے پھر گئے ہیں اور خدا کو نہیں مانتے۔ سبطین اور فیاض پہلے دہریہ کہلائے، پھر فلسفی مشہور ہوئے، پھر شاعر سمجھے گئے، پھر شرابی کہلائے، پھر رنڈی باز کا خطاب ملا۔ اور آخر میں تان قومی لیڈری پر ٹوٹی۔ یہ تمام منزلیں انھوں نے بڑی باقاعدگی سے اور بہت سرعت سے طے کی تھیں۔ خدا کے وجود کے مسئلہ کو ایک لایعنی بحث قرار دے کر انھوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ میدان ایسا ہے کہ آدمی کا قدم ذرا چوک جائے تو وہ شاعری کی سرحد میں جا پہنچتا ہے۔ سبطین اور فیاض خاں اپنی چوک پر مطمئن تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دن میں شاعری چھوڑ چھاڑ نثر پہ آ رہے۔ پھر ایکا ایکی انھیں خیال آیا کہ اہل قلم بننا ایسے کون سے کمال کی بات ہے 'مستانہ جوگی' اور 'مست شباب'' رسالوں کے افسانہ نگار بھی اہل قلم کہلاتے ہیں اور اخباروں کے دفتروں میں جو لوگ کبروں کا لنگڑی زبان میں ترجمے کرتے ہیں انھوں نے بھی اپنا نام اہلِ قلم رکھ چھوڑا ہے۔ قلم کو قلمدان میں رکھ کر انھوں نے تماش بینی کا شیوہ اختیار کیا۔ ہر کوٹھے پر پہنچے اور ہر مجرے میں شریک ہوئے۔ یکایک ان پر یہ انکشاف ہوا کہ عورت بازی خاصا پیش پا افتادہ مشغلہ ہے۔ باوا آدم کے وقتوں سے لوگ اس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور پٹی پٹائی چیز کو پیٹ رہے ہیں۔ وہ پھر کبھی اس بازار میں نہیں دیکھے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے جو مشغلہ اختیار کیا اس کے بارے میں راویوں کے بیانات بہت متضاد ہیں۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ ان پر سرے سے کان ہی نہ دھرا جائے۔ البتہ اتنا طے ہے کہ انھیں بہت جلد یہ احساس ہو گیا تھا کہ جس مشغلہ کو انھوں نے نیا اور انوکھا سمجھا تھا وہ بھی بہت پٹا پٹایا رستہ ہے۔ اس مشغلہ سے کھٹا کھایا تو وہ پھر کتابوں پہ جھک گئے اور اس مرتبہ ان پر یکایک قومی اصلاح کا بھوت سوار ہوا۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں سے

ان کے رستے قدرے الگ الگ ہوئے ورہن اب تک تو وہ قدم سے قدم ملائے اس طرح چل رہے تھے کہ ان کی چالوں میں فرق کرنا مشکل کیا ناممکن تھا۔ دونوں عالم فاضل دونوں جنونی۔ لیکن اب دونوں کی حیثیتوں کا فرق واضح ہونے لگا۔ سبطین تو خرد کی گتھیاں سلجھاتا رہ گیا لیکن فیاض خاں نے ترقی کر کے ایک مجذوب کی حیثیت اختیار کر لی۔ تھوڑے دن تک اس نے بھی سبطین کے ساتھ ساتھ قوم کے زوال کے اسباب پر غور کیا تھا لیکن بہت جلد وہ مردِ مجاہد بن کر میدانِ عمل میں اتر آیا۔ یوں عمل کے میدان میں سبطین بھی بعد کو آ گیا لیکن اس کی حیثیت پھر بھی ایک مفکر ہی کی رہی۔ مردِ مجاہد وہ کبھی نہ بن سکا۔

سبطین، سبطین سے ڈاکٹر سبطین ہوا اور ہوتے ہوتے پروفیسر ڈاکٹر سبطین بن گیا۔ کالج کے لڑکوں کی طرف سے قبولِ عام کی سند عطا ہوئی۔ دوسرے پروفیسر خوب بن ٹھن کر رہتے تھے، طرح طرح سے اپنی قابلیت کا سکہ جماتے تھے، پھر بھی لڑکے ان میں کیڑے ڈالتے تھے اور نہیں تو ٹائی کی گرہ پر ہی نکتہ چینی شروع ہو جاتی تھی۔ لیکن پروفیسر ڈاکٹر سبطین کا سب سے بڑا وصف یہی سمجھا گیا کہ وہ بال بکھیرے خاکی کرتا پائجامہ پہنے کالج چلے آتے ہیں اور یہی وصف ان کی قابلیت اور علمیت کی دلیل بن گیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے طلبہ میں ایک ہیرو بلکہ دیو مالا کی ایک شخصیت کی حیثیت اختیار کر لی۔ فلسفیوں، شاعروں اور مجذوبوں کے جذب وشوق اور قلندری کی ساری روایات ان سے وابستہ کر دی گئیں۔ اگر طلبہ قابل اعتبار راوی ہو سکتے ہیں تو پھر کئی ایک لڑکیاں بھی ان پر جان دینے لگی تھیں۔ لیکن انھوں نے اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا نہ جانا اور پروفیسری چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھ رہے اور قومی اصلاح کی غرض سے ایک اخبار نکالنے کی ٹھانی۔ رفتہ رفتہ پروفیسر ڈاکٹر سبطین خالی ڈاکٹر سبطین رہ گئے اور

پروفیسر کے لفظ کے ساتھ جمع کا صیغہ بھی غائب ہوا (رفیا کے لئے وہ پہلے بھی سپّو میاں تھے، اب بھی سپّو میاں رہا)۔

سبطین نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بڑے دھڑلے سے ایک انگریزی اخبار نکالا۔ فیاض خاں کو ایک خط لکھا گیا کہ قوم کو عمل کی کوئی راہ دکھاؤ اور اخبار کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ تک اپنی آواز پہنچاؤ۔ فیاض خاں نے شروع میں تو کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اس مضمون کے بہت سے خط جمع ہو گئے تو اس نے خط میں سارا قصہ مختصر کر کے یہ شعر لکھ بھیجا۔

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
نصیب تجھ کو فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

لیکن ڈاکٹر سبطین کی تیزیٔ ادراک خاک کام نہ آئی اور اخبار بالآخر بند کرنا پڑا۔ سبطین اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کو گھن لگ چکا ہے۔ البتہ مسلمان عوام میں ابھی جان باقی ہے اور اگر اسلامی انقلاب کی توقع کی جا سکتی ہے تو انہی عوام سے کی جا سکتی ہے۔ ان عوام تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے ایک اردو اخبار کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اسلامی عوامی انقلاب کی تحریک کی بنا ڈالی گئی اور بڑے ٹھسے سے اخبار ''انقلاب'' جاری کیا گیا۔ فیاض خاں کو مضمون کے لئے پھر زور شور سے خط لکھے گئے اور فیاض خاں نے پھر وہی دوٹوک جواب دیا کہ قوم کو فکر کی نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے۔ قوم کو فکر کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔ اسلامیع وامی انقلاب کے مجوزہ نقیب متوسط طبقہ سے بھی بازی لے گئے۔ چنانچہ ''انقلاب'' کو اتنی عمر بھی نصیب نہ ہوئی جتنی انگریزی اخبار کو نصیب ہوئی تھی۔ آخر پرچے کا ایڈیٹوریل سبطین نے بڑے خضوع وخشوع سے لکھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ہاتھ کانپ رہا تھا اور قلم

چل رہا تھا۔ ایڈیٹوریل کے دوران میں تو نہیں لیکن اسے پورا کر چکنے کے بعد ضرور سبطین کو یہ خیال آیا کہ یہ ایڈیٹوریل مولانا محمد علی کا ایڈیٹوریل ثابت ہوگا اور ''انقلاب'' کے دفتر میں چندہ یوں برسے گا جیسے کبھی ''ہمدرد'' کے دفتر میں اس کی بارش ہوئی تھی۔ بارش کا انتظار کیا گیا لیکن بارش نہیں ہوئی۔ دفتر میں چندے کا کوئی منی آرڈر موصول نہ ہوا۔ البتہ وی پی کے چند پرچے ضرور واپس آئے۔ اور سبطین نے اس سوچ میں ایک وقت کا کھانا نہیں کھایا کہ آخر مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمان کیا ہوئے۔ اس پرچے میں قوم کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے اعلان تو یہی کیا گیا تھا کہ یہ آخری پرچہ ہے۔ لیکن واقعہ یوں ہے کہ اس کے بعد دو اشاعتیں اور بھی نکلیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ گن کر نہیں بلکہ تُل کر بکیں۔

فیاض خاں کا طور کچھ اور تھا۔ باپ کی مارا باندھی سے وہ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھ گیا تھا اور پاس بھی کر لیا تھا۔ وہ یوں بھی مطمئن تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ کلکٹری کی تقریب سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے مواقع زیادہ میسر ہوں گے۔ پہلے اس کا تقرر لکھنؤ میں ہوا تھا۔ لیکن اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ دفتری خط و کتابت میں اس نے کچھ ہی عذر پیش کیا ہو گھر بیٹھ کر اس نے یہی کہا کہ لکھنؤ جا کے کیا کروں گا۔ جس شہر کے نوجوان مثنوی ''زہر عشق'' پڑھ پڑھ کر زہر کھا لیں اور سقے تھیٹر دیکھنے کے شوق میں مشکیں بیچ ڈالیں، اس شہر کے لوگوں سے کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس نے کہہ سن کر اپنا تقرر کلکتہ میں کرا لیا۔ بنگالی مسلمانوں سے اسے بڑی توقعات تھیں لیکن پتہ یہ چلا کہ بنگال کے مسلمان دہشت پسند مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رخصت ہو گئے۔ فیاض خاں نے کلکتہ سے اپنا تبادلہ

جنوبی ہند میں کرایا۔ سواحل مدراس کے جنوب کیع لاقے میں موپلوں کا ایک بڑا جتھا آباد تھا۔ فیاض خاں کو ان مسلمانوں میں بڑی جان نظر آئی۔ اس نے پورے زور شور سے تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ لیکن موپلوں میں جتنی جان تھی اس میں تولہ ماشہ کیا رتّی بھر کا بھی اضافہ نہ ہوا البتہ اس کی کلکٹری کی جان پہ بن آئی۔ فیاض خاں نے دَن سے استعفیٰ داغ دیا اور جنوبی ہند سے بگٹٹ لاہور پہنچا۔ پنجاب سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ آخر سرسید نے بھی تو اسی صوبے سے ساری توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس نے راستے میں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ 'زندہ دل' کا خطاب تو اب خاصا بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اب پنجاب والوں کو کسی اور خطاب سے نوازنا چاہیے۔ لاہور پہنچ کر اپنے زمانے کے اس سرسید نے ایک سڑے بسے کالج میں پروفیسری کر لی۔ لیکن اصل مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ یہ تو ملاقات کی تقریب نکالی گئی تھی۔ مسلمانوں کی جس بستی میں بھی جایئے اس میں ایک ڈیڑھ مجذوب کسی کونے کھدڑ میں پڑا پڑایا مل ہی جاتا ہے۔ یہاں فیاض خاں کی مڈبھیڑ مزمل سے ہو گئی۔ مزمل میں پیغمبر بننے کی تو نہیں لیکن پیغمبر کی ناک کا بال بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ مزمل اپنی صلاحیت کی بنا پر فیاض خاں کا مرید ہوا تھا۔ فیاض خاں کا اس میں کچھ کمال نہ تھا۔ فیاض خاں نے لاہور کی ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچہ چھان مارا مگر دوسرا مرید اسے نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ آخر لاہور کے بارے میں اسے اپنی رائے بدلنی ہی پڑی۔ اسی زمانے میں اس کے والد ملازمت سے پنشن پا کر اپنے وطن پشاور پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے اسے بلوا بھیجا۔ لیکن اس نے انھیں ٹکا سا جواب لکھ دیا کہ پٹھان قوم جاہل۔ میری بات نہیں سمجھے گی۔ میں وہاں آ کر کیا کروں گا اس کے بعد اس نے مزمل کو اپنا خلیفہ بنا کر لاہور میں چھوڑا اور بستر بوریا باندھ سرسید کے محبوب صوبے سے سرسید کے محبوب شہر کا رخ کیا۔ وہاں جا کر اس نے

رسل گنج میں تالوں کی دوکان کھول لی۔ لیکن علی گڑھ نے لاہور کے بھی چونا لگایا۔ یہ تو سرسید جانیں کہ وہ مسلمان قوم کو کیا بنانا چاہتے تھے، صاحب جنوں یا اہل خرد۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ علی گڑھ والے چلتا پرزہ بن گئے تھے۔ انھوں نے فیاض خاں کو پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیا۔ ذوقِ جنوں کا ٹوٹا تو لاہور میں بھی تھا لیکن وہاں بانگی کو تو ایک مل ہی گیا تھا۔ یہاں بانگی بھی میسر نہ آئی۔ البتہ علی گڑھ والوں نے فیاض خاں کے تالوں کی خوب قدر کی۔ یہ بھی عجب لطف رہا کہ ہر جگہ فیاض خاں کا ثانوی کاروبار چلا اور اصل مال کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ حسن پور والوں نے اس کی تعریفوں کے پل باندھے اور کہا کہ پٹھان ہو کے ایسی شستہ اور رواں اردو بولتا ہے۔ انھوں نے اس کی تقریروں پر واہ واہ کی لیکن تقریروں کے موضوع کو گول کر گئے۔ کلکتہ میں کلکٹری خوب چمکی لیکن لیڈری کا رنگ پھیکا رہا۔ موپلوں نے اس کے اخلاق اور شرافت کے گن گائے لیکن اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا لوہا ماننے سے انکار کر دیا۔ لاہور میں پروفیسری خوب چلی مگر تبلیغ کی دال نہ گلی۔ علی گڑھ والوں نے تالے ہاتھوں ہاتھ خریدے لیکن اسلامی عوامی انقلاب کے مال کو ہاتھ نہ لگایا۔ غرض فیاض خاں کی اردو دانی سے لے کر قفل سازی تک ہر چیز چل گئی، نہ چلی تو اصلاحی اور انقلابی تحریک نہ چلی۔

مدرسۂ اسلامیہ سے جب نوکری کا پروانہ آیا تو فیاض خاں نے رسل گنج کی تالوں کی دکان میں اسی شان سے تالا ڈالا جس شان سے کلکٹری کو لات مار کر استعفیٰ داغا تھا۔ یہ سچ ہے کہ سرسید کے محبوب صوبے اور محبوب شہر نے اس کی قدر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن سرسید کے اصل وطن کو آزما لینے میں مضائقہ بھی کیا تھا۔

فیاض خاں کے سر مین ایک سودا سمایا ہوا تھا۔ اس کی خاطر وہ بستی بستی گھوما اور

شہر شہر کی خاک چھانی۔ حسن پور سے کلکتہ، کلکتہ سے جنوبی ہند، جنوبی ہند سے لاہور، لاہور سے علی گڑھ، علی گڑھ سے دلّی، فیاض خاں تو واقعی اپنے زمانے کا سیّد احمد خاں بننے پر تلا ہوا تھا۔

— ● — ● —

(2)

رفیا نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ''لو میاں دس سالے انگریز کا ٹنڈ یرا بندھ گیا۔''

کالے خاں ہکا بکا رہ گیا۔ علّن پنواڑی بھی ایک مرتبہ تو چونک ہی پڑا لیکن اس میں بے سوچے سمجھے ایمان لانے کی صلاحیت کم تھی اور پھر یوں بھی انگریزوں سے اسے ہمیشہ سے اُنس تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور رفیا کے اعلان کا بڑے کلبیت آمیز انداز میں استقبال کیا، ''چنڈو خانے سے سن کے آیا ہوگا بے۔''

''چنڈو خانہ تیری جاداد ہے۔ میں وسے ہاتھ نئیں لگاؤں گا۔''

''تو پھر کسی چڑی مار سے سن کے آیا ہوگا۔'' علّن نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

تھوڑی بہت زمین تو ضرور تیار ہو گئی تھی لیکن رفیا ابھی اپنا آزمودہ داؤں مارنے سے گریز کر رہا تھا۔ 'چڑی مار' کا لفظ سن کے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

آخراس نے اپنا داؤں مار ہی دیا۔ ''مرغی کے، اخبار کو چڑی مار بتاوے ہے۔ سالے سپّو میاں نے خود اخبار سے پڑھ کے مجھے یو خبر سنائی ہے۔''

اخبار اور پھر سپّو میاں۔ علّن غریب بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ دوہری مار سے تو اچھے اچھے نہیں پنپتے۔ کالے خاں تو پہلے ہی وار میں کشتہ ہو چکا تھا۔ البتہ علّن کے اعتراضات سے اس کے ایمان میں خلل پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن اخبار اور سپّو میاں کا نام سن کر اس کا تذبذب پھر یقین سے بدل گیا۔

سبطین کی ذات سے کسی اور کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن رفیا کو اس سے فائدہ بہت پہنچا تھا بو جی تو بیٹے کے متعلق ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ 'ملّی کا گو ہے... لیپنا نہ پوتنا۔'' لیکن اسے مبالغہ آرائی سمجھنا چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے ایسی چیز کوئی پیدا نہیں کی ہے جس کا کوئی مصرف نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ سبطین کی علمیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اسلامی عوامی انقلابی تحریک کے کام نہ آئی لیکن اس کے بل پر رفیا نے تو اپنی سیاسی بصیرت کے جھنڈے گاڑ ہی دیے علّن کی دکان پر رفیا کے کسی بیان میں جب کبھی بھی کسی شبہ کا اظہار کیا گیا اس نے وہی اپنا آزمودہ نسخہ استعمال کیا کہ ''سپّو میاں یو کہہ رہے تھے۔'' اور اس فقرے کے ساتھ ساتھ سارے اختلافات اور سارے شبہات ختم ہو جاتے تھے۔ دنیوی معاملات میں تو لوگ سبطین کو بو جی کی تقلید میں واقعی بلی کا گو سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے علم و فضل اور اس کی سیاسی باریک بینی کا لوہا فضل حق وکیل سے لے کر علّن پنواڑی تک سب ہی مانتے تھے۔ لہٰذا جب کبھی کسی عالمانہ بحث میں رفیا نے اپنے ''سپّو میاں کا حوالہ دیا۔ معترضین کی زبان بند ہو جاتی تھی۔ گویا علّن کی دکان پر بیٹھنے والوں نے سبطین کو اچھی خاصی 'صحیح بخاری' سمجھ رکھا تھا لیکن صحیح بخاری کے متعلق رفتہ رفتہ محققین نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ اس میں یاروں نے بہت سی غلط حدیثیں بھی

شامل کر دی ہیں۔ رفیا کے حوالہ کی صحت کا ایک دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ سوال اٹھا تھا۔ رفیا نے بھی غضب کیا تھا۔ جا بے جا وقت بے وقت سپّو میاں کے وہ اتنے حوالے دیتا تھا کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا تھا کہ سپّو میاں رفیا سے کچھ بات بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن رفیا بڑے دعوے بلکہ رعونت سے کہتا تھا کہ ''اجی مجال ہے سپّو میاں کی کہ میں ان سے پوچھوں اور وے جواب نہ دیں۔'' دروغ بر گردنِ راوی، رفیا کی باتوں سے یہی پتہ چلتا تھا کہ گھر میں رفیا کی بات چلتی ہے۔ اور سپّو میاں تو فالتو کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بو جی کے پیٹ سے ضرور پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ آنکھوں کا تارا رفیا کو سمجھتی ہیں اور یہ کہ سپّو میاں کو سوائے رفیا سے باتیں کرنے اور اس کے سوالوں کے جواب دینے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ علّن تو تھا ہی شکّی۔ اور رفیا کا عروج یوں بھی اسے گوارا نہ تھا۔ ایک روز اس نے بھن کر کہہ ہی دیا کہ ''پیارے تجھے بچارے سپّو میاں مل گئے ہیں۔ سیدھے سادے بھولے بھالے۔ ون پہ دھونس جمالیتا ہے۔ ہوتے اگر ڈپٹی صاحب زندہ تو بچو چھکڑی بھول جاتا۔''

رفیا بہت پھنپھنایا۔ تاؤ میں آ کر بولا — ''بھتنی کے، ڈپٹی صاحب کا زمانہ بھی دیکھا ہے میاں دے تو میری ایسی خاطر کریوں تھے کہ کیا کوئی کرے گا۔ ایک دفے سپّو میاں نے کڑوی بات کہہ دی تھی۔ اکڑ گیا۔ وَن سے ڈپٹی صاحب کو خط ڈال دیا کہ میں دلّی آ ریا ہوں جی۔ سپّو میاں سے میری نئیں پٹتی۔ بس جی چل کھڑا ہوا۔''

''اور سپّو میاں نے تجھے جانے دیا؟'' علّن تو قدم قدم پر شک کا اظہار کر رہا تھا۔

رفیا طنز آمیز انداز میں ہنسا، ''سپّو میاں کے فرشتے خاں کو بھی پتہ نئیں چلا۔ بو جی کو میں نے یہ ٹاما دیا کہ جی سلیما دیکھنے جا ریا اوں۔ بس جی میں جو دلّی پہنچا تو موٹروں کی ایک لین لگی ہوئی تھی۔ ڈپٹی صاب تھے بڑے رعاب شعاب کے آدمی۔

میرا خط پہنچا تو ویسرائے کو کہلا بھیجا کہ ہمارے منشی جی آرہے ہیں۔ سواری بھیج دو۔''

''منشی جی!'' علّن بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کالے خاں کی بھی ہنسی چھوٹ پڑی۔

یہ واقعی رفیا کا کمزور پہلو تھا۔ وہ جھینپ گیا اور محض اس جھینپ کو مٹانے کی خاطر اس نے زیادہ زور شور سے اپنا قصہ سنانا شروع کردیا— ''تو بھیا جب میں موٹر میں بیٹھ کے چلا ہوں تو بس یہ سمجھ لو کہ بزار والے گھور گھور کے دیکھیں تھے اور سلام کریں تھے۔''

''سوچتے ہوں گے کہ دلّی میں نیا جناور کون سا آ گیا۔''

رفیا علّن کے اس فقرے کو صاف پی گیا اور پھر شروع ہو گیا— ''پیارے دل میں بڑی سیریں کیں۔ رائے سینا کے برتر جمعہ محبت لگی ہوئی تھی۔ روزینہ واں پہ جاتا تھا اور قطب صاحب کی لاٹھ پہ چڑھتا تھا۔''

کالے خاں کی آنکھیں تارا بن گئیں— ''قطب صاب کی لاٹھ پہ چڑھتا تھا؟''

''ہاں بے اور کیا میں جمعہ محبت انڈے دینے جاتا تھا۔'' رفیا کو کالے خاں کی جہالت پہ اکثر غصہ آجاتا تھا۔

''سالے پھر تو دلّی چھوڑ کے یاں کیوں ایسی کی تیسی کرانے آ گیا؟''

علّن کا سوال واقعی ٹیڑھا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی دنداں شکن ملا— ''یاں تیری ایس کی تیسی کون کرتا۔'' پھر رفیا لہجہ بدلتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولا— ''اماں بات یہ تھی کہ ڈپٹی صاب خود مجھے پہنچانے آئے۔ میں نے کہا کہ یار رفیا جانے بھی دے۔ سپّو میاں کو ہی بڑا بن جانے دے مگر فر سپّو میاں نے مجھ سے معافی مانگ لی۔''

کمبخت علّن پھر ہنس پڑا۔

علّن کی ہنسی نے کام خراب کر دیا۔ کالے خاں پر بھی وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

رفیا جھلّا پڑا۔۔ "سالے مرغی والے میر ایقین نئیں آ تا مت کر تیری اماں گلشن جو ہے وس سے جا کے پو چھ لے۔"

کالے خاں نے تو فوراً یقین کر لیا۔ علّن کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر اس نے بھی ہتھیار پھینک دیے۔ کالے خاں نے کبھی اس غریب کا آخر وقت تک ساتھ ہی نہیں دیا۔ جہاں ذرا رفیا کی آواز میں گرمی آئی اس کی تشکیک کا سارا نشہ ہرن ہو جا تا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ خود بھی سچ بولتا ہے اور باقی سب لوگ بھی سچ بولتے ہیں۔ جھوٹوں کو ساری دنیا جھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کو اس کی پٹھانی تک میں شبہ ہوا تھا۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک مرتبہ اپنی پٹھانی پر ایمان لے آنے کے بعد اسے پھر کبھی اس میں شبہ نہیں ہوا۔ پھر دوسرے کیا کر لیتے۔ دراصل سچ اور جھوٹ کا تعلق خارجی دنیا سے تو ہے نہیں۔ یہ تو دو الگ الگ ذہنی کیفیتیں ہیں۔ جو بات دیانتداری سے محسوس کی گئی ہے اور مدعی کی شخصیت کا جز بن گئی ہے۔ وہ سچ ہے۔ یہ سوال اٹھانا کہ اس بات نے خارجی دنیا میں ظہور کیا ہے یا نہیں۔ سچ کے تصور کو مسخ کرنا ہے اگر کہنے والے کی نیت میں فتور ہے اور اس کا دعویٰ اس کی شخصیت کا جز نہیں بن سکا ہے تو اس کا خارجی دنیا میں لاکھ وجود ہو۔ وہ کھلا ہوا جھٹ ہی رہے گا۔ ممکن ہے کالے خاں دون کی لیتا ہو مگر بولتا تھا وہ سچ۔ آخر اتنے سید کہاں سے آ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ خاندانِ رسالت سے عشق کرنے میں ایک منزل وہ آتی ہے کہ آدمی خود اپنے آپ کو اس خاندان میں سے سمجھنے لگتا ہے۔

کالے خاں کے لئے پٹھانی دین ایمان کا معاملہ تھی وہ اس کے خون میں رچی ہوئی ہو یا نہ ہو اس کی ذہنیت میں ضرور بس گئی تھی۔ پٹھانی اس کی شخصیت ہی کا نہیں اس کے نام کا بھی جزو بن چکی تھی۔ اب یہ کون کہہ سکتا تھا کہ کالے خاں ایک زمانے میں کالے خاں نہیں بلکہ کلّو تھا۔ اس زمانے میں اگر کوئی ٹھکانے کا ماہر لسانیات ہوتا تو کالے خاں کے نام پہ تحقیق کرنے بیٹھ جاتا اور لفظوں کی شکلیں بدلنے کے متعلق ایک اچھا خاصا نظریہ وضع کر لیتا۔ خیر ہے تو یہ لسانیات کا موضوع مگر اشارتاً اتنا بتا دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے کہ کالے خاں اصل میں کالے خاں نہیں تھا اس کا اصل نام کیا تھا، یہ تو شاید کوئی بھی نہ بتا سکے۔ اس کے ماں باپ ضرور بتا سکتے تھے مگر اس کے ماں باپ تھے کہاں۔ وہ تو ان شخصیتوں میں سے تھا جن کا کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا۔ لیکن جو محلوں کی زندگی کا لازمی جز ہوتے ہیں۔ وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا یا کہیں باہر سے آیا تھا، کہاں سے آیا تھا، کون تھا، آسمان نے اُگلا تھا یا زمین سے اُگا تھا۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ شاید اسی لئے اسے پٹھان بننے میں کسی خاص دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ چونکہ وہ کالا بھجنگ تھا اس لئے محلّہ والوں نے اسے کلّو کہنا شروع کر دیا۔ کلو سے وہ کلوا بنا اور پھر کالے کہلانے لگا۔ ابھی وہ کالے ہی بنا تھا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ سپاہیوں کی بھرتی شروع ہوئی تو اس کا نمبر بھی آ گیا۔ پیدل فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پہ لد گیا۔ مگر بڑا سخت جان نکلا بچ کر صحیح سلامت آ گیا۔ لڑائی سے واپسی پر وہ دو تحفے اپنے ساتھ لایا۔ مونچھیں اور پٹھانی۔ شروع شروع میں اس نے اپنی زبان میں بھی پٹھانیت پیدا کرنے کی جان توڑ کوشش کی تھی۔ اپنے لئے وہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ اودھ کی آواز کو بڑے سلیقے سے کچل کر 'ہم' کو 'ام' کہتا تھا۔ لیکن اس کوشش میں اس نے منھ کی کھائی۔ رفتہ رفتہ وہ پھر اپنی سیدھی سادی زبان بولنے لگا۔ دراصل

محاذ پر اسے پٹھان رجمنٹ کے ساتھ رہنا پڑا تھا اور واں پٹھانوں سے وہ ایک نیا جذبہ لے کر گھر پہنچا تھا۔ یوں کالے، کالے خاں بن گیا۔ کالا بھجنگ، لمبا تڑنگا، بھرے بھرے ڈنڑ۔ یہ لمبی لمبی کالی مونچھیں، بر میں خاکی کرتا، ہاتھ میں بلم لگی ہوئی لاٹھی۔ کالے واقعی کالے خاں لگتا تھا۔ جس کسی نے اس کی پٹھانی میں شک کی نیت باندھی کالے خاں لڑنے مرنے پہ تل گیا۔ لٹھ پونگے سے دنیا ڈرتی ہے اور اس کی تو یوں بھی شہر بھر میں دھاک تھی۔ کس کے سر میں پھوڑا نکلا تھا جو اس سے لڑائی باندھتا۔ کالے خاں کا رنگ تو یہی بتاتا تھا کہ وہ مٹی کا بنا ہوا ہے اور مٹی بھی دکن والی کالی مٹی۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے تو وہ نرا آگ تھا۔ بس یوں سمجھو کہ انگارہ خاکی تھا۔ ذرا سی بات پہ فوں خاں ہو جاتا تھا پھر وہ لڑائی ٹھنتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ پورے پورے خاندان لاٹھیاں لے کر نکل آتے تھے اور اس کی لاٹھی کا لوہا مان کر واپس جاتے تھے۔ شہر کا کون ساتیس مار خاں تھا جس کو اس کی لاٹھی کا تجربہ نہ تھا۔ سنتے ہیں کہ کالے جب لڑائی پر چلا گیا تھا تو چند سر پھرے تیس مار خانوں نے بہت سر اٹھایا تھا۔ ہر بات میں رفیا اور علّن کے منہ آتے تھے۔ لیکن جب کالے پلٹا اور اپنی کالے خانی کا اعلان کیا تو یہ سارے تیس مارکاں جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ رفیا اور علّن یوں کالے خاں پر فقرہ بازی بھی کر لیتے تھے اور اس سے ہر طرح سے کمزور ہونے کے باوجود اس پر دھونس بھی جما لیتے تھے لیکن آڑے وقت میں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ لاٹھیاں تانے ہوئے دیکھے گئے۔ بلکہ وہ تو دراصل 'پیراں نمی پرند مریداں نمی پرانند' والا مضمون کرتے تھے۔ کالے خاں جو کچھ تھا وہ تو تھا ہی۔ اس کی شخصیت کے گرد ہار بننے کا کام زیادہ تر رفیا نے اور تھوڑا بہت علّن نے انجام دیا تھا۔ اس کی کالے خانی کا چرچا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ علّن نے حسب عادت شروع میں اس کی پٹھانی میں شبہ ضرور ظاہر کیا تھا۔ لیکن

کالے خاں نے ایسے وثوق سے پشاور کا ذکر کیا کہ اسے آخر یقین کرنا ہی پڑا۔ کالے خاں نے اسے یقین دلانے کے لئے یہاں تک کہا تھا کہ فیاض خاں اسی محلّہ کا رہنے والا ہے جس کا وہ رہنے والا تھا۔ وہ روز اسے کالج جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا (فیاض خاں کی روایت یہ تھی کہ والد کے ساتھ ساتھ وہ سلسلۂ تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی پشاور سے چلا آیا تھا)۔

کالے خاں کو شہرت علّن کی دکان سے حاصل ہوئی۔ علّن کی دکان کی ساکھ کالے خاں کی وجہ سے قائم ہوئی۔ اگر کالے خاں اس دکان پر آ کر نہ بیٹھا کرتا تو اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی۔ اور اگر کالے خاں وہاں آ کر نہ بیٹھا کرتا تو پھر کہاں جا کر بیٹھا کرتا۔ اصل بات یوں تھی کہ اس پورے کارواں میں مرکزی حیثیت نہ تو کالے خاں کو حاصل تھی اور نہ رفیا کو اور نہ علّن کو۔ یہ حیثیت تو دکان کو حاصل تھی۔ علّن یوں تو پنواڑیوں ہی کی صف میں گنا جاتا تھا لیکن اگر کوئی یہ چیلنج کر بیٹھتا کہ علّن کی دکان نہیں ہے تو اس کو جھٹلانا واقعی بہت مشکل ہو جاتا۔ اس دوکان پر پان ضرور بکتے تھے لیکن شیشے کے ان میلے مرتبانوں کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جن میں سے کسی میں کشمکش کسی میں چھوارے، کسی مین چنے، کسی میں سوکھی سڑی گڑ دھانیاں اور نہ جانے کس میں کیا کیا بھرا رکھا تھا۔ دراصل ان میں سے زیادہ تر چیزیں روکن کے سلسلہ میں صرف ہوتی تھیں یا پھر رفیا اور کالے خاں دو دو چار چار دانے نکال کر ٹو نگتے رہتے تھے۔ لیکن ایسے ناعاقبت اندیش بچے بھی تھے جو واقعی گڑ دھانیاں خرید کر لے جاتے تھے۔ گڑ دھانیوں میں تو خیر مکھیوں کے فضلے کے سوا اور کوئی خاص عیب نہ ہوتا تھا لیکن ریوڑیوں سے تو بری طرح تمباکو کی بو آتی تھی۔ پھر بھی بعض کامل اور ست بچے فقیرا حلوائی کی دکان تک جانے سے گھبراتے اور علّن سے ریوڑیاں خرید کر لے جاتے جو

نام کوریوڑیاں اور اصل میں تمبا کو ملا گڑ ہوتا تھا۔ البتہ باوا آدم کے کی پرانی وہرانی ہنڈیوں اور مٹکیوں میں جو دالیں بھری رکھی تھیں، وہ خوب بکتی تھیں۔ گاہکوں کو یہ شکایت تو ضرور تھی کہ علّن کی دالوں میں مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے، لیکن معاشی مقاطعہ کا خیال وہ کبھی دل میں نہیں لائے۔ البتہ چلموں میں جو الماری کے خانوں اور طاقوں میں چنی رکھی تھیں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں پایا گیا کہ گرد زیادہ جم جانے کی وجہ سے ان کی چمک دمک مدھم پڑ گئی تھی۔ پتنگوں کے سلسلہ میں سرے سے اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پتنگ اڑانے والے بالعموم صرف پتنگ سے غرض رکھتے ہیں اور نئی پرانی کا سوال نہیں اٹھاتے۔ علّن کی دکان میں ایسی چیزیں بھی خاصی تعداد میں تھیں جن کا تعلق خرید وفروخت سے نہیں بلکہ آرائش سے تھا۔ وہ ان گنت بوتلیں جن میں رنگ برنگا پانی بھرا رکھا تھا اور جن پہ گرد کا خاصا دبیز غلاف چڑھ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ زیبائش کی غرض سے چنی گئی تھی نرگس اور ثریا کی تصویروں کے علاوہ اس تصویر کا مقصد بھی سوائے آرائش کے اور کچھ نہ تھا جس میں ایک برہنہ عورت ململ کے ایک دھجی بدن پر لپیٹے مور کو دانہ ڈال رہی تھی۔ رہا مولانا محمد علی، مصطفیٰ کمال، علامہ اقبال اور قائد اعظم کی تصویروں کا سوال تو ان کی حیثیت بیک وقت افادی بھی تھی اور جمالیاتی بھی۔ البتہ گاما، بھولو اور گونگے کی تصویریں خالی خولی جلال کی مظہر تھیں۔

اس دکان میں گنانے کی اور چیزیں بھی تھیں، لیکن گنتی گنانے سے فائدہ۔ علّن تو پاؤں سے لے کر گڑ دہانیوں تک ہر سودے کی چیز کو ثانوی حیثیت دیتا تھا۔ اس دکان کا اصل مال تو کالے خاں اور رفیا تھے۔ مگر دقت یہ تھی کہ یہ بکاؤ چیزیں نہیں تھیں۔ بس آؤ دیکھ جاؤ جس کسی نے بھی یہاں کھڑے ہو کر رفیا سے دلّی کا حال اور کالے خاں سے پشاور کی خوبیاں سنیں وہ تاریخ کا ایک نیا شعور اور جغرافیائی معلومات

کا ایک نادر خزانہ لے کر واپس ہوا۔ یہ عجیب بات تھی کہ کالے خاں، رفیا اور علن ایک بھی تھے اور الگ الگ بھی تھے۔ وہ ترقی پسندوں سے اس لحاظ سے بہر صورت مختلف تھے کہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی شخصیتوں میں اور اپنے اندازِ فکر میں اپنی اپنی انفرادیت قائم رکھی تھی۔ رفیا جذبِ دروں کا قایل تھا۔ ہر بات پوری شدت سے محسوس کر کے کہتا تھا۔ علّن کا شمار اہل خرد میں ہونا چاہیے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک محسوسات کا بادشاہ تھا، دوسرا معقولات کا حلقہ بگوش تھا، اور وہ تیسرا شخص کالے خاں قوم کی شانِ جلالی کا مظہر تھا اور ذوقِ یقیں کی دولت سے مالا مال تھا۔ پھر ان کی دلچسپیاں بھی جدا جدا تھیں۔ رفیا دلّی کا دیوانہ تھا۔ کالے خاں پشاور پہ فدا تھا۔ علّن انگریز کے نام کا عاشق تھا۔ اس نے انگریز کی آخر دم تک حمایت کی۔ لیکن اگر انگریز کی عقل ہی گدی کے پیچھے جا لگی تھی اور وہ خواہ مخواہ ہندوستان سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا تو علّن آخر کیا کر لیتا۔ اس نے اپنی سی بہت کی اور رفیا کے ان سارے بیانات کی جو وہ انگریزوں کی مخالفت میں دیتا تھا، تردید کرتا رہا۔

رفیا نے اخبار اور سپّو میاں کا حوالہ دے کر علن کو وقتی طور پر لاجواب ضرور کر دیا تھا، لیکن کالے خاں کی طرح وہ بے دال کا بودم تو نہ تھا کہ بے سوچ بچار کئے اس کی بات مان لیتا۔ اس روز اس نے دن بھر اس مسئلہ پر غور کیا اور سارے سیاسی حالات کا تفصیل سے جائزہ لے ڈالا۔ اور آخر معاملہ کی تہہ تک پہنچ ہی گیا۔ شام کو جب چوکڑی جمی تو سب سے پہلی بات جو علّن نے کی وہ یہی تھی۔ یہ واقعی حیرت کی بات ہے کہ دو پہر بھر اس نے کیسے ضبط کیا تھا۔ رفیا کو مخاطب کر کے بولا— ''رفیا بے کھل گئی بات؟''

''بس کھل گئی بات۔ یار جی بھی اڑتی چڑیا کو پہچانتے ہیں۔''

رفیا کے لہجہ میں اک ذرا گرمی پیدا ہوئی۔ ''ابے بھتنی کے بات تو بتا۔ خوامخواہ دون کی لے ریا اے۔''

اور اب علن سنبھل کر بولا۔ ''یار وہی انگریز کی بات۔ بچو تم نئیں جانتے وسے۔ میں جانوں ہوں۔ بہت اڑنگے باز ہے سالا۔''

''مگر پیارے اب تو وس کی ساری اڑنگے بازی دھری رہ گئی۔ منٹوں میں بستر بوریا بندھ گیا۔''

علن تڑپ کر بولا۔ ''یار تو بالکل ڈیوٹ ہے۔ قسم اللہ پاک کی انگریز بہت چارسوبیس ہے۔ وس نے دونوں کے ایسا سنبھال کے چونا لگایا ہے کہ بیٹا کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

''کیا چونا لگایا ہے؟'' رفیا تو خیر چونکا ہی تھا، کالے خاں بھی گوش بر آواز ہو گیا۔

''دیکھو نا ہندو مسلمانوں میں جو لڑائیاں ہو رہی ہیں۔'' علن کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی گویا وہ کوئی بہت بڑا راز افشا کر رہا ہے۔ ''یہ لڑائیاں انگریز کرا رہا ہے۔''

''ہٹ بے۔'' رفیا نے حقارت آمیز انداز میں اسے جھڑک دیا۔

یہ بات اتنی مضحکہ خیز تھی کہ کالے خاں کو بھی اس کا یقین نہ آیا۔ بولا۔ ''ابے سالے علن تو جھوٹ کے گولے لڑھکا وے ہے۔''

''اچھا تو مت مانو۔ ایک دن خود مان لو گے کہ نائی نائی بال کتنے۔ کہ جی ججمان جی آگے ہی جو آئے جاوے ہیں، تو جی ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو۔ دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم پوچھیں گے کہو بچو کیا کہتے ہو۔''

''کیا ہوگا بے؟'' رفیا نے بظاہر اپنے حقارت آمیز انداز کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن دراصل وہ یہ جاننا بھی چاہتا تھا کہ علن کو مستقبل میں کیا نظر آ رہا ہے۔

علّن نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔۔ ''جب اچھی طرح لڑائی ہو لے گی تو انگریز ہندوؤں، مسلمانوں دونوں کو بلائے گا، کہے گا میاں کس برتے پر تتا پانی۔ حکومت تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر دونوں کو ٹھوکر مار کے کہے گا، ہٹو جی ہندوستان، پاکستان دونوں ختم بس ہم حکومت کریں گے۔''

''وا بے مرغی کے۔'' رفیا بے ساختہ بول اٹھا۔ ''ہندوستان پاکستان دونوں ختم، منہ دھوا کے آنا۔''

کالے خاں کو بھی شہ ملی۔ بولا ''استاد میں ہندوستان کی تو کہتا نئیں ہوں۔ وے ہے بنیا۔ مگر پاکستان سے اکڑ تکڑ کی تو وہ اس سالے انگریز کا مار مار کے بھُس بھر دے گا۔''

رفیا نے بہت زور شور سے تائید کی۔۔ ''پیارے پاکستان اب وُس کے جھانسے میں نئیں آتا۔ صاف ہری جھنڈی دکھا دے گا۔ اور یو سالے اپنے کرموں کو روئیں گے۔''

اس دوران میں شیرو پلہ دار بھی موقعہ واردات پہ آ پہنچا تھا۔ چند منٹ تک تو اس نے یہ باتیں سنیں اور پھر اس انداز سے گفتگو میں کھنڈت ڈالی گویا اسے اس پورے قضیے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بولا۔۔ ''لاؤ خلیفہ ذریوں بیڑی پلاؤ۔''

شیرو نے بیڑی کا بنڈل کھول کر ایک بیڑی نکال کر ہونٹوں میں تھامی اور بولا۔۔ ''انگریز سالا تو جا ہی ریا اے، پر ایک بات بتائے دوں ہوں....'' اور اس نے بڑے اطمینان سے اپنی بیڑی جلی ہوئی رسّی سے لگا کر سلگانی شروع کر دی۔ رفیا کا

اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ علّن کو یہ دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی بات انگریز کے خلاف اس کے منھ سے نہ نکل جائے۔ کالے خاں کو سو فیصدی یقین تھا کہ شیرو جو کہے گا پاکستان کے حق میں کہے گا۔ شیرو جب بیڑی سلگا چکا تو اس نے اطمینان سے ایک زور کا کش لیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا— ''بڑا خون خرابا ہوگا۔''

شیرو کے فقرے نے خاطر خواہ اثر کیا۔ سارے چہروں پر سنجیدگی کی فضا طاری ہو گئی۔ مگر علّن اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا۔ بولا— ''ہاں جی انگریز کے پاس مشین گن ہے۔ ایک ایک کو بھون ڈالے گا۔''

شیرو بھنّا کر بولا— ''سالے انگریز کو گولی مارو۔ میں کہہ ریا اوں۔'' اور یکا یک اس کی آواز میں سرگوشی کا سا انداز پیدا ہو گیا، ''ہندو نے بڑی تیاریاں کی ہیں۔''

کالے خاں نے بڑے حقارت آمیز انداز میں جواب دیا— ''شیرو سالے تیری تو ابھی سے میا مر گئی۔ تیاریاں کر لی ہیں کر لینے دے اپنے ٹھینگے سے۔ سالوں نے کالے خاں کو نئیں دیکھا ہے۔''

شیرو خاموش ٹکٹکی باندھے کالے خاں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا— ''کالے خاں... اچھا جانئیں کہتا... بڑا خون کرابا ہوگا کالے خاں۔''

شیرو نے زور سے بیڑی کا کش بھرا اور دوکان سے خاموش آگے بڑھ گیا۔

— ● — ● —

(3)

اُس روز سبطین کی بیٹھک میں اتنے لوگ جمع تھے کہ ایک اچھا خاصا سیاسی جلسہ منعقد کیا جا سکتا تھا۔ مجمع کرنے اور باتیں گھوٹنے کا چسکا سبطین کو 'انقلاب' کے بند ہو جانے کے بعد لگا تھا۔ اس زمانے میں تو اخبار کا اتنا کام تھا کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ پھر یہ کہ دل کا غبار اخبار کے ذریعہ نکلتا رہتا تھا۔ خیالات کا طوفان امنڈا، جی بھاری بھاری ہوا، اداریہ لکھ ڈالا، طبیعت ہلکی ہوگئی۔ اخبار بند ہو جانے کے بعد طبیعت ہلکی ہونے کا یہ راستہ مسدود ہو گیا۔ لیکن سینے کا طوفان اپنے اخراج کے لئے خود کوئی نہ کوئی رستہ پیدا کر ہی لیتا ہے۔ قلم نہیں چلتا تو زبان چلتی ہے۔ زبان نہیں چلتی تو دوسرے اعضاء حرکت میں آتے ہیں۔ زندگی بہر صورت حرکت ہے۔ ''انقلاب'' بند ہوا، اس کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلابی عوامی تحریک ٹھپ ہوئی۔ اس کے ٹھپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبطین کی ساری سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ اب سبطین تھا اور اس کی خالی بیٹھک۔ کام وام کچھ نہیں۔ مگر اس صورت حال کو لازمی طور پر جمود تو

نہیں کہا جا سکتا۔علّن پنواڑی کی مثال لے لیجئے۔کبھی کسی نے اسے اپنے تھڑے سے اٹھتے نہیں دیکھا۔دن ہو،رات ہو،وقت ہو بے وقت ہو،جب دیکھو علّن اپنی دکان میں موجود۔لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی مین حرکت تھی،حرارت تھی۔ جہاں کالے خاں اور رفیا آ کر بیٹھیں اور جہاں شیروا آ کر چکر کاٹے وہاں سے زیادہ حرکت اور حرارت کہاں ہو سکتی تھی۔ چراغ سے چراغ جلتا ضرور آیا ہے اور اگر زندگی ارتقا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ سبطین نے علّن کو دیکھا دیکھی یاروں کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔علّن اور سبطین میں یوں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔دل کو سمجھانے کا گر دونوں سے آتا تھا۔اپنی ناکامی کی توجیہات کرنے میں دونوں کو کمال حاصل تھا۔محسوسات کی بنیاد پر معقولات کی عمارت کھڑی کرنے کے انگھڑ کام کو دونوں نے آرٹ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔مگر یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ سبطین علّن کی پیروی کرتا تھا یا علّن سبطین کی نقل کرتا تھا۔بس یوں سمجھئے کہ دونوں کو ایک ہی قسم کا وجدان عطا ہوا تھا اور اس کے اشارے پر وہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں حرکت کرتے تھے۔سبطین کبھی کسی کے گھر یہ کہنے نہیں گیا کہ صاحب آپ ہمارے گھر آیا کیجئے۔چُگا تو جہاں ہوتا ہے، چڑیاں خود ہی پہنچ جایا کرتی ہیں۔ پہلے چند پرانے طالب علموں نے جنہیں پروفیسر ڈاکٹر سبطین کی ذات سے عشق ہو گیا تھا آنا جانا شروع کیا پھر ایک افسانہ نگار کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ پھر محلّہ کے ایک وکیل صاحب کو یکا یک القا ہوا کہ ڈاکٹر سبطین قانون کا بھی شناور ہے۔اس سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے۔ پھر نمبردار صاحب چونکے اور انھیں خیال آیا کہ انھیں اپنی بیٹیوں کو کالج میں داخل کرانا چاہیے اور اس سلسلہ میں اگر کوئی شخص ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر سبطین ہے۔محلّہ کے ڈاکو نے محض اس بات سے مرعوب ہو کر ڈاکٹر سبطین کے

پاس دنیا بھر کے رسالے اور اخبار آتے ہیں، بغیر کسی وجہ سے اس کے یہاں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔ یوں شہر کے سارے پیاسے کوئیں کے گرد خود بخود جمع ہو گئے۔ جو شخص بھی زندگی سے بیزار ہوا اور جسے دنیا میں کہیں ٹھکانا نظر نہ آیا اس نے سبطین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ سبطین اسلامی عوامی انقلابی تحریک کی مسیحائی نہ کر سکا لیکن ویسے اس نے بہت سے لوگوں کے درد کا درماں کیا۔ اس زمانے میں ہر احساس پر موت کا احساس غالب آ گیا تھا۔ ہر شخص مایوس اور زندگی سے کچھ بیزار سا نظر آتا۔ ایسے موقعوں پر کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ سبطین نے اس ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ لوگوں کو ایک سہارا ملا اور سبطین کو یہ امید ہو چلی کہ اب اسلامیع وامی انقلابی تحریک پنپ جائے گی۔

اس وقت بحث ایک بہت نازک منزل پر آ پہنچی تھی۔ سیاسی موضوعات کی ایک طویل فہرست پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی تھی اور ہر مرتبہ آخر میں سبطین کی رائے قطعی قرار پائی تھی۔ مگر جب گاندھی جی کی شخصیت معرضِ بحث میں آئی تو حق صاحب نے سبطین کے نقطہ نظر کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ ''سبطین صاب! یوں آپ اس شخص کو کچھ بھی کہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس زمانے کی عظیم شخصیت۔''

حق صاحب کا فقرہ ختم ہو گیا، لیکن سبطین کی سگریٹ کا کش کچھ اور زیادہ طویل گیا۔ سگریٹ کا کش ختم کر لینے کے بعد بھی اس نے بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نمبردار صاحب نے اس وقفہ کو غنیمت جانا۔ بولے'' بھئی بات یہ ہے کہ یہ اس شخص کا ہی دم ہے کہ ہندوستان میں آج مسلمان زندہ ہیں۔ ورنہ....''

حق صاحب کو جوش آ گیا۔ نمبردار صاحب کا فقرہ کاٹتے ہوئے بولے۔
''یہ واقعہ ہے صاحب اب دیکھئے وہ شخص دلّی مین خود میواتیوں کے کیمپ میں گیا۔''
''بہت بڑا آدمی ہے صاحب۔'' نمبردار صاحب ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولے۔

سبطین بدستور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ وہ تو غنیم کو پیش قدیم کا پورا پورا موقعہ دیتا تھا اور پھر اچانک ٹوٹ پڑتا تھا۔

حق صاحب کے لہجہ میں رقت پیدا ہوگئی۔ ''یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کے دل میں انسانیت کا بڑا درد ہے۔''

''اس بصیرت افروز حقیقت کا احساس آپ کو یکا یک ۴ جون کی صبح کو ہوا تھا۔''

حق صاحب پہلے ہی حملہ میں ہڑ بڑا گئے۔ جیسے تیسے کر کے انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جواب دینے کی نیت باندھی۔ مگر سبطین تو پے در پے حملوں کا قائل تھا۔ چلتے چلتے ایک اور وار کر دیا۔ ''حق صاحب! ۱۵ اگست کے بعد آپ پر حقیقتوں کا تابڑ توڑ نزول ہو رہا ہے۔ اس کیمپ کو آپ کہاں لنگھوائیں گے۔''

حق صاحب سنبھلے تو خیر کیا تھے، لیکن جواب تو بہر صورت ضروری تھا۔ بولے۔ ''سبطین صاحب! آپ کا یہ طنز نازیبا ہے۔ گاندھی جی کے سیاسی نظریات سے مجھے اختلاف تھا مگر ان کی شخصی عظمت کا میں ہمیشہ معترف رہا۔''

''اب سیاسی نظریات کے بھی معترف ہو گئے؟''

اس فقرے پہ حق صاحب ٹپٹائے تو بہت لیکن انھوں نے اوسان بجا رکھے اور اقرار اور انکار دونوں سے پہلو بچا کر ایک تیسرا راستہ نکالا۔ ''دیکھئے اس اعتراف یا اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ بعض نئی حقیقتیں ہمارے

سامنے آ رہی ہیں اور انھیں ہمیں قبول کر لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"بس ایک گھونٹ پانی کی ضرورت ہے۔" سبطین کا لہجہ بظاہر بہت دھیما تھا۔

"آپ ان گولیوں کو حلق سے نیچے اتار ہی لیں گے۔حق صاحب آپ کے ہاضمہ پر مجھے رشک آتا ہے۔"

نمبردار صاحب بحث کے دوسرے رستوں پہ بہک جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھے۔ بحث کو اصل موضوع پر لاتے ہوئے بولے— "اب گاندھی کی وسعت قلب کا...."

"وسعت قلب؟" حمید ڈاکیہ قطعی غیر متوقع طور پر چونکا۔اب تک وہ صرف سننے کا فرض انجام دے رہا تھا۔" آپ تو جی یہ کہتے تھے کہ گاندھی بڑا متعصب اور تنگ نظر...."

نمبردار صاحب حق صاحب کے مقابلہ میں زیادہ حوصلہ والے آدمی تھے۔حمید کی بات کاٹتے ہوئے بہت اطمینان سے بولے— "میرا اعتراض گاندھی جی کی دو ایک باتوں پہ تھا۔ویسے یہ ان کی انسانیت کا (نمبردار صاحب نے 'وسعت قلب' کے لفظ کو حذف کر دینا ہی مناسب سمجھا) ثبوت ہے کہ انھوں نے اردو کی حمایت کی ہے۔"

"ہاں صاحب ورنہ اس زمانے میں اردو کی حمایت کوئی سیاسی مصلحت تو ہو نہیں سکتی تھی۔"

سبطین چارپائی پر بیٹھا تھا۔اس نے لپٹے ہوئے بستر پر کمر ٹیک کر پھر سگریٹ کے کش اطمینان سے لینے شروع کر دیے تھے۔ بحث میں ایک نیا پہلو نکل آیا تھا اور وہ بہت سکون سے سوچ رہا تھا کہ کس پہلو سے دشمن کی جارحانہ کارروائی کا جواب دیا جائے۔لیکن اتنے میں بیٹھک کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ کا سارا

نقشہ بدل گیا۔ فیاض خاں کو دیکھتے ہی سبطین اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے فیاض خاں تم؟ کون سی گاڑی سے آئے؟ علی گڑھ میں خیریت ہے؟ کھانا کھاؤ گے نا؟ سامان تانگے سے اتار لیا؟''

سبطین نے تو سوالوں کی ایک پوری قطار باندھ دی تھی۔ لیکن فیاض خاں نے صرف آخری دو سوالوں کا جواب دیا۔ اور وہ بہت مختصر ''کھانا کھاؤں گا، سامان آ گیا۔''

فیاض خاں آدمی تھا رعب داب کا۔ واقعی پشاور کا پٹھان تھا۔ لمبا تڑنگا، سرخ و سفید رنگ۔ جسم بھاری بھر کم نہیں تھا۔ لیکن بدن کی ہڈی چوڑی تھی۔

لباس کے نام خاکی کرتا، خاکی پائجامہ، عینک لگی ہوئی۔ سر پر بھورے بھورے خشک بالوں کا ایک چھپّر (فیاض خاں کا سر اکثر استرے سے گھٹا ہوا بھی دیکھا گیا تھا)۔ اس درویشانہ حلیہ نے اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ آدمی دیکھتے ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ کمرے میں اس کے گھستے ہی حاضرین میں سناٹا چھا گیا۔

پھر جب کھانا آیا تو تھوڑی دیر تک کمرے میں فیاض خاں کے نوالے چبانے کی آواز گونجتی رہی۔ باقی سب چپ تھے۔ آخر سبطین نے اس سکوت کو توڑا۔۔۔ ''بھئی فیاض خاں۔ اردو کا ذکر چل رہا تھا۔ حق صاحب کو اسرار ہے کہ گاندھی جی نے اردو کی حمایت کر کے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ وسیع القلبی کا مظاہرہ ہے وسیع القلبی نہیں ہے۔''

فیاض خاں حق صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آپ کونٹ کا تماشہ دیکھنے کا بڑا شوق معلوم ہوتا ہے۔'' اور اس نے ایک چوتھائی روٹی کا نوالہ بنا شوربے میں ڈبو

منھ میں رکھ لیا۔

سبطین فیاض خاں کے اندازِ بیان کو خوب سمجھتا تھا۔ اس فقرے سے وہ بہت مطمئن ہوا۔ لیکن حق صاحب چکرا گئے، "کیا مطلب فیاض صاحب؟"

"مطلب یہ ہے کہ نٹ کا تماشہ دیکھنے کا شوق ہے تو یہاں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ جا کر کسی وسیع القلب شخص کی زیارت کیجئے۔"

حق صاحب بہت بھنائے۔ "آپ صاحب کمال کرتے ہیں۔ آپ وسیع القلبی کو نٹ کا تماشہ بتاتے ہیں۔"

"نٹ کا تماشہ نہ سہی مداری کے ہاتھ کی صفائی سہی۔ بہر حال ایک ہی بات ہے۔ سب وسیع القلب لوگوں کا ایک ہی حال ہے۔ وہ سب کچھ ہوتے ہیں بس وسیع القلب نہیں ہوتے۔ دنیا کے سارے آزاد خیال اور انسان دوست بازی گر ہیں اور کچھ نہیں۔ شاید یہ آزاد خیالی کا لفظ کسی بازی گر ہی کے ذہن کی اختراع ہے۔"

فیاض خاں جس راستے پر چل پڑا تھا وہ اس کا اپنا راستہ تھا۔ حق صاحب اور نمبردار صاحب کے تو اس کے تصور سے بھی پر جلتے تھے۔ نمبردار صاحب نے بحث کو کھینچ کر موضوع پر مرکوز کرنے کا فرض پھر انجام دیا۔ "فیاض صاحب نیت کو نہ دیکھئے، یہ دیکھئے کہ اردو کے بارے میں گاندھی کے اس بیان سے مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے؟"

"فائدہ؟" فیاض خاں رکا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ نوالہ حلق سے نیچے اتر جائے۔ "اردو کی حمایت اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمنی ہے۔"

حق صاحب اور نمبردار صاحب کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سبطین نے گھور کر فیاض خاں کو دیکھا اور بولا — "وہ کیسے؟"

فیاض خاں نے جواب دیا— ''کیسے ویسے کچھ نہیں، مسلمان دوسروں کے کہے گھوڑے پہ نہیں بیٹھتے۔ خود ہار کر گدھے کی سواری کر لیتے ہیں۔ پہلے انھوں نے انگریزی پڑھنے سے انکار کیا تھا اور ہندو سے سو سال پیچھے رہ گئے۔ اب ہندی پڑھنے سے انکار کرتے ہیں، سو سال اب پیچھے رہ جائیں گے۔''

''دو سو سال۔'' نمبردار کے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ ''کچھ نوکریاں پہلے ہندو کے قبضہ میں چلی گئیں۔ کچھ اب چلی جائیں گی۔''

''اور آپ موچی کے موچی یعنی نمبردار کے نمبردار رہ جائیں گے۔'' فیاض خاں نے جس بے ساختگی سے یہ فقرہ کہا تھا اسی بے ساختگی سے گلاس اٹھایا پانی پی کر کلّی کی اور چارپائی پر لیٹ کر چادر اوڑھتے ہوئے بولا— ''اچھا بھئی میں سوتا ہوں۔ مجھے صبح ہی دلّی جانا ہے۔''

''دلّی؟'' سبطین کے قدموں تلے کی زمین نکل گئی۔

''ہاں دلّی۔''

''کیوں؟''

''علی گڑھ پر تین حرف۔ مدرسۂ اسلامیہ کا پروانہ آیا ہے۔ وہاں جاتا ہوں۔''

''مگر آج کل دلّی کی فضا...۔''

''فضا وضا کچھ نہیں میں جا رہا ہوں۔ اچھا اب مجھے سونے دو۔'' فیاض خاں نے کروٹ لے کر چادر میں منھ لپیٹ لیا۔

فیاض خاں نے باتوں کا مزہ کرکرا کر دیا۔ باتوں سے دھیان ہٹا تو لوگوں کو یاد آیا کہ رات ہو چلی ہے۔ فضا کشیدہ ہے۔ جلد گھر پہنچ لینا چاہیے۔

حق صاحب راستے میں چلتے چلتے کہنے لگے— ''ذرا خوش ہے صاحب،

اٹھنے بیٹھنے بولنے بات کرنے کی مطلق تمیز نہیں ہے۔ دیکھتے تھے کھانا کیسے کھا رہا تھا، جیسے قیدی کھاتے ہیں۔ ایک ایک روٹی کا ایک ایک نوالہ...حد ہے۔''

''پشاور کا ڈگا۔'' نمبردار صاحب نے ساری بات کو ایک اصطلاح میں سمو کر مختصر کر دیا۔

حمید ڈاکیہ نے بھی ٹانگ اڑانی ضروری سمجھی۔ ''کہتا ہے ہندی پڑھو۔''

''یہ سچ کہتا ہے۔'' نمبردار صاحب نے جواب دیا۔ ''مسلمانوں کے لئے واقعی اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی لڑکی کے لئے ہندی کے ماسٹر کا انتظام کر لیا ہے۔''

''آپ نے؟'' حق صاحب چونکے۔

''صاحب اس میں ایسے چونکنے کی کیا بات ہے؟'' نمبردار صاحب کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''نمبردار صاحب! میں اس پہ نہیں چونک رہا۔ میں تو خود اس کے حق میں ہوں۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ کی لڑکی آج کل میں پاکستان جانے والی ہے۔''

نمبردار صاحب بات کو ٹالتے ہوئے بولے۔ ''نہیں بھئی راستے مخدوش ہیں۔ ابھی جانے آنے کا کیا سوال ہے۔''

''آپ کا خود کا کیا ارادہ ہے؟'' حق صاحب تو بے چارے نمبردار کے پیچھے ہی پڑ گئے۔

نمبردار حسرت بھرے لہجے میں بولے۔ ''ارے بھائی ہم کیسے جا سکتے ہیں۔ آخر ان زمینوں کا کیا کریں؟''

''ہاں صاحب، یہی آفت ہے۔''

اس فقرے کے ساتھ گفتگو بند ہو گئی۔ البتہ سڑک پر دیر تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔

—●—●—

فیاض خاں بڑے اطمینان سے پڑا سنار ہا تھا۔ لیکن سبطین بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ شروع میں وہ خود سونے پہ مائل نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے پریشان اور پراگندہ خیالات تھے جو اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ ایک دو مرتبہ تو اس کے بدن میں جھرجھری سی بھی پیدا ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ان خیالات میں اسے ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے نیند کی سرے سے پرواہی نہیں کی۔ لیکن جب اس کے دماغ نے کوئی نئی بات سوچنے سے انکار کر دیا اور وہی پرانی تصویریں بار بار نظروں کے سامنے آنے لگیں تو پھر اسے سونے کا خیال آیا۔ لیکن نیند نہ جانے کدھر سٹک گئی۔ اب ذہن بھی خالی تھا اور آنکھیں بھی۔ اس نے پوری یکسوئی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن ذہن کے کسی کونے کھدڑے سے کوئی بچی کھچی ادھوری تصویر ابھرتی اور بار بار اس یکسوئی میں خلل ڈال دیتی۔ ایک مرتبہ اسے جھپکی آئی بھی تھی لیکن بغیر کسی وجہ کے وہ چونک پڑا۔ اور آنکھ کھل گئی۔ دوسری مرتبہ جب اس پہ غنودگی طاری ہوئی تو وہ واردات گزری کہ جو کوئی بھی ہوتا اس کی آنکھ کھل جاتی۔ سامنے کے مکان کی چھت سے گانے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی لیکن اوّل تو یہ نسوانی آواز تھی۔ پھر اس میں ایک درد کی بھی کیفیت تھی۔ اس لئے اگر سبطین کے کان اس طرف لگ گئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوئی۔ نیند کی پریاں جو

دبے پاؤں آرہی تھیں۔ وہ ایکا ایکی پھر غائب ہوگئیں۔ اس کا سامعہ پورے طور پر بیدار ہوگیا۔ گانے کی آواز دھیمی ہوتی گئی، دھیمی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ گنگناہٹ میں تبدیل ہوگئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ لیکن سبطین کو یوں محسوس ہوا کہ جہاں سے یہ پرسوز راگ ابھرا تھا وہاں بدستور کوئی چیز دھڑکے جارہی ہے۔ اس کا دل بھی دھڑکنے لگا۔ لیکن بڑی نرم روی کے ساتھ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھی ان پہرے داروں کی آواز آجاتی تھی جو محلوں میں نئے نئے مقرر ہوئے تھے۔ ہوا خاموش تھی۔ البتہ ستاروں سے لدا پھندا آسمان کچھ متحرک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ستارے کچھ عجب بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ایک خاصے بڑے رقبے میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ان میں اکا دکا ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لیکن بعض مقامات پر ستاروں کا جھرمٹ کچھ اس طرح بن گیا تھا جیسے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہو۔ کئی ایک جگہ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے چمکتے ذروں سے بھری پچکاری چھوڑی جا رہی ہو۔ ایک سمت میں ننھے منے ستارے آپس میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ ان کا الگ الگ وجود بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ بہت سے ستارے تاؤ کھا کر پگھل گئے ہیں اور آسمان کے دامن پر روشنی کا ایک بڑا سا دھبہ پڑ گیا ہے۔ ان ستاروں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ فضا کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے اور آسمان کے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہو گئی ہے۔ سبطین نے یوں محسوس کیا کہ خنکی کے نرم نرم گالے پگھل کر اس کی آنکھوں میں گھل مل رہے ہیں۔ لیکن چت پڑے پڑے اسے اب کچھ بے آرامی سی محسوس ہونے لگی تھی اس نے بائیں ہاتھ کو کروٹ لی۔

فیاض کاں شاید اس کے کروٹ لینے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ نہ معلوم اس کی آنکھ کس وقت کھل گئی تھی۔ بولا ــ ''سبطین جاگ رہے ہو؟ کیوں، نیند نہیں آتی؟''

''ہاں کچھ نیند اچٹ سی گئی ہے۔''

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچتا ہوں کہ تم دلّی جا رہے ہو۔''

''تو پھر؟''

''پھر کچھ بھی نہیں۔''

فیاض خاں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دونوں چپ چاپ لیٹے آسمان کو تکتے رہے۔ فضا کا دل اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ دھڑکے جا رہا تھا۔ مشرق کی سمت میں ایک ستارہ ٹوٹا اور ایک سفید دھاری یوں پڑتی چلی گئی جیسے کسی کے گلے میں خراش پڑ جاتی ہے۔

آخر سبطین پھر بولا — ''فیاض خاں! سو گئے؟''

''نہیں۔''

''تم دلّی کیوں جا رہے ہو؟''

''جھک مارنے۔''

''اور علی گڑھ میں کیا کرتے رہے تھے؟'' سبطین کو بھی آخر تاؤ آ ہی گیا۔

''جھک مارتا تھا۔''

''پھر یہ دلّی کا شوق کیوں چرّایا ہے؟''

''علی گڑھ کے نوجوانوں سے جھک ماری اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اب سوچتا ہوں کہ مدرسہ اسلامیہ کے نونہالوں سے بھی جھک مار کے دیکھ لوں۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کہ تم دلّی نہ جاؤ۔ پاکستان چلے جاؤ۔ وہاں تحریک کے پنپنے کا بڑا امکان ہے۔''

''تم غلط سمجھتے ہو؟''

''ٹھیک سمجھا ہوں۔''

''سنو، علی گڑھ سے بہت سے تالے والے اور کچھ پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹری اور چالاک تھانیدار پاکستان گئے ہیں۔ چلتے وقت ان میں سے ہر شخص نے یہی اعلان کیا تھا کہ ہم پاکستان کی تعمیر کرنے جا رہے ہیں۔ پاکستان ان کا استقبال کرے گا۔ ہمارا تمھارا استقبال نہیں کرے گا۔ پاکستان کو اناڑی قفل سازوں، پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹروں اور چالاک تھانیداروں کی ضرورت ہے۔ ہماری تمھاری ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''مت مانو۔''

''تم دلّی جا کر وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''وقت تو ضائع ہو چکا۔ وقت اب ہے کہاں جو ضائع کروں۔'' گفتگو کے دوران میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ فیاض خاں کے لہجہ میں رقت کی کیفیت پیدا ہوئی۔

سبطین نے پھریری لی اور بولا — ''وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔ وقت نے کروٹ لی ہے۔''

فیاض خاں نے بڑے طنز سے پوچھا — ''کیا پاکستان جانے کا منصوبہ ہے؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' سبطین نے بڑے طنطنہ سے جواب دیا۔

''پھر مجھے کیوں ہدایت کی جا رہی ہے؟''

''میں جاؤں گا تو یہ فرار ہوگا۔ تم جاؤ گے تو یہ وطن کو واپسی ہوگی۔''

فیاض خاں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ فضا بدستور جاگ رہی تھی۔ سکوت کا بے پایاں راگ درد

وسوز کی مخصوص کیفیت کے ساتھ نرم روی سے کروٹیں لئے جا رہا تھا۔

''سبطین۔'' اس مرتبہ فیاض خاں کی طرف سے پہل ہوئی۔

''ہوں۔''

''یہ سامنے والے مکان میں کون آ کے رہا ہے؟''

سبطین چونک پڑا۔ ''کوئی نہیں۔ عجیب سے لوگ ہیں۔ مرد راتوں کو جانے کہاں مٹر گشتیاں کرتا ہے۔ عورت آہیں بھرتی ہے یا کلیلیں کرتی ہے۔''

''تمھارا اس سے کوئی تعلق ہے؟''

اس دوٹوک فقرے پر سبطین ہڑ بڑا گیا۔ ''نہیں... نہیں۔ کیوں۔''

''نہیں ہے تو پیدا کر لو۔'' فیاض خاں نے اپنے معروضی انداز میں اب تک کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔

سبطین نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''میرا وجدان کہتا ہے کہ تم کسی نہ کسی روز ضرور محبت کرو گے۔''

سبطین بھنا کر بولا۔ ''اچھا وجدان ہے تمھارا۔''

''میرا وجدان کبھی غلط نہیں کہتا۔'' فیاض خاں نے بڑے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ ''دراصل تم میں سوائے عورت سے محبت کرنے کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ تم اب تک اپنے آپ کو نہیں پہچانے۔ تم ہمیشہ وقت کے بعد جاگتے ہو۔ ایک روز تمھیں یکا یک اپنی اصل صلاحیت کا پتہ چلے گا اور تم کسی لڑکی سے محبت کرنا شروع کر دو گے۔ مگر اس وقت وہ تمھیں منہ نہیں لگائے گی۔ ابھی موقعہ ہے۔ وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔''

''اچھا چپ رہو۔'' سبطین کا غصہ سے برا حال ہو گیا تھا۔

فیاض خاں چپ ہو گیا۔ چند منٹ تک پھر خاموشی طاری رہی۔

''اچھا سبطین یہ بتاؤ کہ اس شخص کی عمر کیا ہوگی؟'' فیاض خاں کرید کرید کر پوچھے جا رہا تھا۔

''ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔''

''بیوی جوان ہے؟''

''بالکل جوان۔'' سبطین کو غصہ بھی آ رہا تھا اور جواب بھی بڑے شوق سے دے رہا تھا۔

''لڑکی ہے یا عورت؟''

''میں اس کا نکاح پڑھانے نہیں گیا تھا جو مجھے اس کی عمر معلوم ہوتی۔'' سبطین کو پھر تاؤ آ گیا۔

''فیاض خاں نے بہت سکون سے جواب دیا— ''بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔ لڑکی اور عورت میں فرق عمر کا نہیں ذہنیت کا ہوتا ہے۔''

''تو پھر یہ عورت ہے۔''

''عورت ہے؟'' فیاض خاں چونکا۔ ''تو معاملہ ٹیڑھا ہے۔ اب تم ہاتھ مت ڈالنا۔''

''کیا مطلب؟''

''بات یہ ہے کہ لڑکی کا معاملہ تو بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ مرجھلّے سے مرجھلا مرد بھی غریب کو دبوچ لیتا ہے۔ لیکن عورت خوفناک چیز ہوتی ہے۔ وہ خود مرد کو دبوچ لیتی ہے۔ ایسے جیالے تو کم ہی دیکھے ہیں جو عورت پر غالب آ جاتے ہیں۔''

''اپنے متعلق کیا خیال ہے تمھارا؟'' سبطین نے جل کر پوچھا۔

''اپنے متعلق؟'' فیاض خاں سوچتے ہوئے بولا۔ ''کبھی کبھی مجھ میں بڑی شدت سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ یہ دھندا چھوڑ دو اور کسی عورت سے ٹکرالو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں عورت پہ غالب آ جاؤں گا اس لئے میں ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔''

سبطین نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ ہونے کے سوا اس کے لئے اور چارہ بھی کیا تھا۔ اتنے میں دور سے گھنٹے کی آواز آئی۔ ایک بج رہا تھا۔

سبطین نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ ''اچھا اب سو جاؤ۔ آدھی رات گزر گئی۔''

فیاض خاں چادر میں منہ لپیٹتے ہوئے بولا۔۔۔ ''آدھی رات ابھی اور باقی ہے۔''

— • — • —

(4)

سنسان بیابان فضا میں زرد رُو چاند اکیلا رینگ رہا تھا۔ خوف و ہراس کی ایک مبہم پراسرار سب کیفیت چاندنی کی نس نس میں رچی ہوئی تھی۔ بلند و بالا عمارتیں، درخت، ٹیلے، یہ سب یوں چپ چاپ کھڑے تھے گویا کسی نامعلوم خوف کے اثر سے سکتہ میں آ گئے ہیں۔ ایک مسجد کے سفید مینار آسمان کی طرف کچھ یوں اٹھے ہوئے تھے گویا تھکے ماندے چاند کو سہما ہوا دیکھ کر بے قراری میں کسی کی باہیں اٹھ گئی ہیں اور اجلے گنبدوں کو دیکھ کر کچھ ایسا گمان گزرتا تھا کہ ایک محبت بھرا سینہ کسی کو اپنے اندر چھپا لینے کے لئے بے تابی سے دھڑک رہا ہے۔ رستے ویران پڑے تھے، گلیاں اور سڑکیں ہُو حق کر رہی تھیں۔ پھیکی پھیکی چاندنی، سہمی ہوئی فضا، چپ چاپ بلند و بالا مکان۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس بستی کے سارے لوگ کہیں باہر چلے گئے ہیں اور مکان ڈھنڈار پڑے ہیں اور پھر یوں محسوس ہوتا کہ ان میں پراسرار روحیں چل پھر رہی ہیں، سرگوشیاں کر رہی ہیں اور جنگلوں اور کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہیں پھر

اچانک کسی بہت دور کی گلی سے ایک قد آور سایہ نکلتا نظر آتا۔ وہ ایک ڈگ میں ایک گلی اور دوسرے ڈگ میں دوسر گلی پار کرتا اور بڑھتا چلا آتا۔ اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر اس کی ڈراؤنی پرچھائیں کانپتی نظر آتی اور پھر بالا قد درختوں اور میدانوں میں سرکتی دکھائی دیتی۔ سایہ ڈک بھرتا ہوا دور نکل جاتا اور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور گلیاں پھر بھائیں بھائیں کرنے لگتیں۔ یوں لگتا کہ فضا کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ ایکا ایکی کسی نامعلوم سمت سے ایک عقاب آہستہ آہستہ اڑتا ہوا آیا۔ ایک منحوس پرچھائیں پھر اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر کانپتی دکھائی دی۔ عقاب اڑتا اڑتا کسی نامعلوم سمت میں کھو گیا۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ چاند کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ جیسے کسی لق ودق صحرا میں کوئی مسافر قافلہ والوں سے چھٹ کر راستہ بھول جائے اور شروع شروع مین خوب دوڑے۔ اتنا دوڑے کہ ہانپنے لگےاور پھر تھک کر رینگنا شروع کر دے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت چاند پر گزر رہی تھی۔ فضا کے ویران اجاڑ بن میں وہ اکیلا بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اتنے میں کسی دور کی گلی سے کسی کے نوحہ کرنے کی پراسرار آوازیں آئیں۔ یہ پراسرار دھیمی آوازیں چند لمحوں کے لئے تیز ہو گئیں۔ مگر پھر مدھم پڑ گئیں۔ چاند کی شکل بدلنے لگی۔ اس کا ایک کنارہ سرخ پڑ گیا۔ جو مکان سنسان ویران پڑے تھے وہ ایکا ایکی ایک کوفناک قسم کے شور سے گونج اٹھے۔ عورتیں، بچے اور مرد چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور شور مچا رہے تھے، چیخیں مار رہے تھے۔ پھر ننگ دھڑنگ فقیروں کا ایک گروہ سرپٹ آتا دکھائی دیا۔ میلے کچیلے سیاہ توا جسم، ڈراؤنے چہرے، لال لال آنکھیں، گردنوں کی رگیں پھولی ہوئی، سانس چڑھے ہوئے۔ انھوں نے گلوں میں جھولیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دوڑتے ہوئے چل رہے تھے اور بے طرح شور مچا رہے تھے۔ سیاہ کتوں کا ایک پورا ہجوم بھونکتا ہوا ان کے پیچھے

دوڑ رہا تھا۔ ہر دروازے پر پہنچ کر وہ گودیاں پھیلا دیتے اور گودیوں میں اناج آ پڑتا۔ وہ پھر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے اور سیاہ کتے جوانھیں رکتا ہوا دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے پھر بھونکتے ہوئے دوڑنے لگتے۔ چاند پر ایک کرب کی کیفیت طاری تھی۔ سرخی پھیلتی گئی، گہری ہوتی گئی۔ سرخی اور پھیلی...اور گہری ہوئی...آدھا چاند سرخ ہو گیا، آگ کے انگارے کی طرح دہکنے لگا، تلوار کے گھاؤں کی طرح خونا خون ہو گیا۔ پھر ایک سمت سے غبار اٹھا۔ زرد زرد غبار بلند ہوتا گیا، پھیلتا گیا۔ آندھی کے جھکڑ چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے فضا میں مکروہ صورت عورتوں کا جلوس نمودار ہوا۔ خون سے لت پت بے سر کے جسموں پر وہ سوار تھیں۔ ان کے لمبے لمبے خشک بالوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور بل کھاتا ہوا سیاہ دھواں ان کے منھ سے نکل رہا تھا۔ ان کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ ان سے کون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور اس جلوس کے ساتھ ساتھ گرج کی آواز سنائی دی۔ زمین ہلنے لگی۔ عمارتیں اڑ اڑ ادھم کر کے کرنے لگیں۔ لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسجد کے مینار سرنگوں ہو گئے اور فضا میں ایک گرجدار آواز گونجی ''گر پڑا، بڑا شہر گر پڑا۔'' کسی نامعلوم سمت سے کسی کے نوحہ کرنے کی آواز آ رہی تھی، ''اے بڑے شہر، اے بستیوں کی ملکہ، افسوس افسوس افسوس....''

ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ بو جی کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، اور دل، بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز بار بار بڑی تیزی سے سینے کی پسلیوں سے آ کر ٹکراتی ہے اور بار بار ایسا لگتا کہ اب پسلیاں چٹخیں اور اب کلیجہ اچھل کر باہر نکلا۔ بو جی کو بہت دیر تک تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ واقعی جاگ پڑی ہیں۔ وہ پوری فضا اپنی شدت کے ساتھ ان کے تصور پر بدستور سوار رہی۔ البتہ اس کا سلسلہ درہم و برہم ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی تصویر نظر کے سامنے آ جاتی، کبھی اس نوحہ کی آواز سنائی دینے لگتی ''اے بڑے

شہر، اے بستیوں کی ملکہ، افسوس افسوس افسوس۔'' لیکن وقت بڑا ظالم ہے۔ کیسی ہی شدید کیفیت ہو، وقت کے ساتھ خود بخود دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ آخر بو جی کی طبیعت ذرا ٹھکانے آئی۔ وہ واقعی جاگ اٹھی تھیں۔ انھیں اب ہوش آیا کہ دراصل یہ سب کچھ واقعی ہوا نہیں ہے، محض اک خواب تھا۔ انھوں نے بڑے خلوص سے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ڈراؤنا خواب تھا، ایک وسوسہ تھا، شیطان نے انھیں ڈرایا تھا۔ اس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں دراصل بہت جلد آ گئی۔ ہوا یوں کہ سوءِ اتفاق سے ان کی جوتیاں سرہانے پڑی رہ گئی تھیں۔ جب جوتیاں سرہانے پڑی ہوں تو پھر اگر ڈراؤنے خواب نہ دیکھیں تو واقعی تعجب کی بات ہے۔ لیکن اس معقول توجیہہ کے باوجود بو جی کا وسوسوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ انھیں بار بار اپنی اماں جی کی یہ روایت یاد آتی تھی کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ایسا چاند گہن پڑا تھا کہ پورا چاند گہنا گیا تھا۔ اور اس روایت کے خیال کے ساتھ ساتھ ان کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی تھی۔

بو جی نے صبح کی اذان کا مطلق انتظار نہیں کیا۔ انھیں وقت کی یوں بھی بہت اٹکل تھی اور پھر ستاروں کی نقل و حرکت نے بھی ان کی تھوڑی بہت مدد ضرور کی تھی۔ انھوں نے منھ ہاتھ دھویا، وضو کیا اور جانماز پر کھڑی ہو گئیں۔ نماز تو انھوں نے جلدی ہی ختم کر لی۔ لیکن تسبیح کا ورد صبح تک جاری رہا۔ جب ذرا اجالا ہوا تو انھوں نے کلام مجید کا جزدان کھول کر اپنی عینک نکالی۔ پھر تلے دانی کھولی۔ اس میں سے تعبیر نامہ نکالا۔ گ کی تختی میں کئی مقامات پر ان کی نظر اٹکی۔ گاجر دیکھنا، گائے دیکھنا... گہن دیکھا... ان کی نگاہیں ٹھٹکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں۔ گہن چاند کا دیکھنا۔ انھوں نے غور سے اس کی تعبیر پڑھی۔ لکھا تھا— ''کال پڑے یا بادشاہ پہ آفت آئے۔ رعایا پریشان ہو۔ جان و مال کا نقصان ہو۔ چاہیے کہ خواب کسی سے نہ کہے۔ رفع بلیات کی خاطر

صدقہ دے۔"

گلشن اٹھ بیٹھی تھی۔ باورچی کانے میں وہ کچھ سٹر پٹر کر رہی تھی۔ یوں تو وہ بہت دیر سے بڑبڑا رہی تھی۔ مگر ایک مرتبہ اس نے شاید بو جی کو سنانے کی غرض سے اونچی آواز سے کہا۔ "کمبخت کا تختہ نکلے، قبر میں وس کی کیڑے پڑیں۔ نرا پانی سا دودھ دے جاوے ہے کل آئے حیضی بچہ وس کے منھ پر ماروں گی۔" گلشن کے فقرے خاصے فکر انگیز تھے۔ لیکن بو جی کو مطلق تحریک نہیں ہوئی۔ ان کی حالت اس وقت بھی غیر تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ چہرہ پیلا پھدّق پڑا تھا۔ گلشن کے فقروں کو انھوں نے سرے سے ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے خاموشی سے جانماز لپیٹی اور ہلتی کانپتی اندر چلی گئیں۔ صندوق کھول کر انھوں نے اپنا کپڑے کا بٹوہ نکالا اور پھر گلشن کو کانپتی ہوئی آواز میں بلایا۔ "گلشن... اری او گلشن! اری یاں آئیو۔"

گلشن دودھ کے متعلق اظہارِ خیال سے تو بے شک اس وقت تک فارغ ہو چکی تھی، لیکن چائے کے ڈبے میں جھاڑو دی ہوئی دیکھ کر اس کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا اور اس وقت وہ رفیا کو غائبانہ لعنت ملامت کر رہی تھی۔ بو جی کا یہ بے وقت بلاوا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ بلکہ اس نے صاف صاف کہہ بھی دیا کہ — "اجی میری دو ٹانگیں ہیں۔ چار ٹانگیں کاں سے لی آؤں۔ چا بناؤں یا تمھاری سنوں۔" مگر اس فقرے سے تعمیل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ تو محض ایک واقعہ کا اظہار تھا یا زیادہ سے زیادہ حرفِ شکایت یا صدائے احتجاج۔ گلشن جب کمرے میں پہنچی تو بو جی بٹوے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولیں — "بی بی رفیا کو جا کے یہ پانچ روپے دے کر بزار سے گیہوں خرید کے محتاجوں میں بانٹ دے اور لے اٹھنی اور دوں ہوں۔ ان کے پیڑے لے کر نکڑ شاہ کے مزار پہ چڑھائیا۔"

گلشن کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ اب وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ غصے کا بھی وقت اور موقعہ ہوا کرتا ہے۔ گلشن نے کبھی بے وقت غصے کا اظہار نہیں کیا۔ اس بے وقت خیرات پہ وہ حیران تو بہت ہوئی لیکن چونکہ بو جی اس راز پر سے پردہ اٹھانے سے گریز کر رہی تھیں اس لئے اس نے بھی انھیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بھی کوئی سنگین مسئلہ در پیش ہوتا تو بو جی ہزار اختلافات کے باوجود خود گلشن سے رجوع کرتی تھیں۔ لیکن جب وہ پراسرار طور پر چپ سادھ لیتیں تو پھر گلشن اپنے وجدان کے زور پر مسئلہ کی تہہ تک پہنچتی تھی۔ اس وقت بھی اگرچہ اسے واقعہ کا علم نہ تھا مگر واقعہ کی نوعیت کو وہ ضرور بھانپ گئی تھی۔ اس نے فی الحال چپ رہنے کا ہی ارادہ کیا تھا۔ اس سنجیدہ محفل میں جس نے جوتی اچھالی وہ سبطین تھا۔ بو جی کو یہ خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ سبطین کس وقت اٹھا اور کس وقت کمرے میں آ بیٹھا۔ شاید یہ سب کچھ ان کی نماز کے دوران میں ہوا تھا۔ سبطین اس وقت کسی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ بو جی کی نقل و حرکت اور گفتگو پر وہ چونکا—

''بو جی صبح ہی صبح یہ کیا ہو رہا ہے؟''

بو جی بہت سٹپٹائیں— ''ارے بیٹا وہ پہلی تاریخ کو نیاز کا نکالنا بھول گئی تھی، آج مجھے خیال آیا۔''

''بھول گئی تھیں تو بس بھول جاؤ۔ یہ تمھیں بھولی ہوئی باتیں رہ رہ کے کیوں یاد آیا کرتی ہیں۔''

بو جی کو بیٹے کا یہ اندازِ گفتگو پسند نہ آیا۔ پھر بھی انھوں نے بڑے ضبط سے کام لیا— ''ارے بھئی مجھے شک آوے ہے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''اچھا شک ہے تمھارا۔ اور حفظ و امان میں تو ہیں۔ آخر کون سی قیامت ٹوٹ

رہی ہے۔'' سبطین تو بو جی کے پیچھے ہی پڑ گیا۔

مگر بو جی نے پھر بھی نرمی ہی سے جواب دیا— ''ارے بیٹا ایسی بدشگنی کی آواز نہیں نکالا کرتے۔ اور بھئی پیسے کا کیا ہے، اپنے ہاتھوں کا میل ہے۔ پیروں فقیروں کے نام کا نکالتے ہوئے کڑھا نہیں کرتے ہیں۔''

سبطین اور گرم ہوا— ''اجی ان پیروں فقیروں کے ٹبر کو کب تک برداشت کرو گی۔ چھٹی کرو نا ان کی۔''

بو جی اس مرتبہ تو تلملا ہی اٹھیں۔ جھلاّ کر بولیں— ''ارے لڑکے ہوش کی دوا لے۔ زبان میں ذرا لگام نہیں ہے۔ سوچے نہ سمجھے جو منھ میں آئی کہہ دیا۔'' اور یکا یک وہ دوسرے رستے پہ چل پڑیں۔ ''ارے بھئی میرے تو ہولیں اٹھے ہیں۔ آج کل کے دن ویسے ہی خراب ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ مجھے طرح طرح کے خیال آوے ہیں۔ مجھے تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔'' بو جی کچھ کہتے کہتے یکا یک چپ ہو گئیں۔

گلشن اب تک کا موش تھی۔ مگر اب اس کے بولنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ اس موقعہ کو اس نے گنوانا مناسب نہ سمجھا— ''اجی بو جی تین دن سے میری سیدھی آنکھ پھڑک رئی ہے۔ اللہ خیر کرے۔''

بو جی نے فوراً اس کی زبان بند کر دی— ''ارے بھئی ایسی آواز منھ سے مت نکالو۔ مجھ رانڈ کا دل ویسے ہی وائی توائی ہے مجھے تو اس گھر کو دیکھ دیکھ کے خفقان ہووے ہے جنیں کیا بات ہے....'' بو جی بولتے بولتے پھر رکیں اور کچھ سوچ کر یکا یک بولیں— ''اری گلشن تو ذرا چا سے فارغ ہو کے مولوی صاحب کے پاس تو جائیو۔ کہنا کہ ہمارے گھر کو کیل دو۔''

اس آخری فقرے پر سبطین بہت گرمایا— ''اجی بو جی یہ کیلنا ویلنا تم نے کیا

لگایا ہے۔"

مگر بو جی نے اس مرتبہ اسے اچھی طرح ڈانٹ دیا۔ "ارے چل رے لڑکے۔ ہمارے آگے کا لونڈا ہمیں نصیحت کرے ہے۔ تجھے کیا ضرورت ہے ان باتوں میں ٹانگ اڑانے کی۔ جا اپنے انھیں سنڈوں مسٹنڈوں میں جا۔ ان سے مغز مارا کر۔"

سبطین کی ساری گرمی بھاپ کی طرح اڑ گئی۔ موقعہ غنیمت جان کر گلشن نے بھی اپنی بزرگی جتانے کے لئے ایک فقرہ کہہ ڈالا۔ "ہاں جی سپّو میاں تم کیا جانو ان باتوں کو۔ اللہ رکھو تم جوان ہو پر یہ مطلب تھوڑا ئی ہے کہ تم بو جی کو نصیحتیں کرو۔ ون کے لئے تو تم کل کے لونڈے ہی رہو گے۔"

اور بو جی نے چلتے چلتے گلشن کو ایک اور ہدایت کی۔ "اور دیکھ ری گلشن، نمبردارنی کے گھر اور وکیل صاحب کے اور کوٹھے والی کے کہہ آئیو کہ جمعرات کو ہمارے گھر مجلس ہے۔"

— ● — ● —

حق صاحب نے نہ معلوم کیا سوچ کر پھر قوم کی رہنمائی کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر ایک نئے انداز سے۔ سیاست سے تو وہ کئی مہینے پہلے کنارہ کش ہو کر گیان دھیان میں مصروف ہو گئے تھے۔ جون ۱۹۴۷ء کا پورا مہینہ تو انھوں نے سوچ بچار میں گزارا تھا۔ مہینے بھر تک ان پر تذبذب کی ایک کیفیت طاری رہی۔ مگر مہینے کے ختم ہوتے ہوتے انھوں نے قطعی فیصلہ کر ہی لیا اور شہری مسلم لیگ کی صدارت سے

مستعفی ہو گئے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ انھیں یکا یک گاندھی جی کی انسان دوستی کا احساس ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آزاد خیالی کا بھی پتہ انھیں اسی زمانے میں چلا تھا۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے تو خود ان کی روایت یہ ہے کہ وہ بہت پہلے سے ان کے علم وفضل کے قائل تھے۔ انھوں نے لالہ رگھوبر دیال بزاز کی دکان پر بیٹھ بیٹھ کر برملا ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھیں یہ بات کھائے جاتی تھی کہ انھوں نے اپنی ساری عمر ایک فرقہ پرست جماعت کی خدمت میں گنوادی۔ ساتھ ہی انھیں اس کا احساس تو ضرور تھا کہ کسی قسم کی بھی کمیٹی بنے کانگریسی مسلمانوں ہی کی اس میں پوچھ ہوتی ہے اور راشننگ کے دفتروں میں تو وہ درّانہ گھسے چلے جاتے ہیں اور پانچ پانچ سیر چینی اور بیس بیس گز کپڑے کے پرمٹ چٹکیوں میں بنوالاتے ہیں۔ لیکن اس احساس کی حیثیت تو ثانوی تھی۔ زیادہ تر تو انھیں ان کا ضمیر، ان کی فرقہ پرستانہ سرگرمیوں پر ملامت کررہا تھا۔ کوئی بھلا مانس ہوتا تو ان کی قلب ماہیت کی قدر کرتا اور انھیں سینے سے لگا لیتا۔ لیکن لالہ رگھوبر دیال تو ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ ان کی دکان پہ بیٹھنے والے دوسرے لوگوں نے ان کی باتوں پر توجہ دی۔ چنانچہ جب بقرعید آئی اور مسلمانوں میں شکر اور کپڑا تقسیم کرنے کے لئے کمیٹی بنائی گئی تو اس میں حق صاحب کو صاف نظر انداز کر دیا گیا۔ امن کمیٹیاں بھی محلّہ محلّہ بنیں مگر حق صاحب غریب کہیں نہ تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے مایوس ہو کر دنیا کے جھگڑوں سے ہی قطع تعلق کر لیا اور گوشہ نشین بن گئے۔ لیکن جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آنی شروع ہوئیں اور شہر کی فضا روز بروز کشیدہ ہوتی گئی تو اس سے ان کے ہیرا پھیری کے میلان کو شہ ملی۔ سبطین نے تو جلسہ میں کئی مرتبہ ان کی ٹانگ لی تھی۔ لیکن وہ کافی سخت جاں نکلے اور آخر شہر کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور ڈھارس بندھانے کا فرض انھیں سونپ

ہی دیا گیا۔

حق صاحب نے اپنا فرض بڑی تندہی سے انجام دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کیفیت ہوئی کہ محلّہ کی دیواروں میں ایک نئی روح دوڑتی نظر آنے لگی، ''اسلام عمل کا نام ہے''، 'مسلمانو عمل کرو''، ''نماز سب سے بڑا عمل ہے''، ''روزِ محشر کہ جاں گداز بود، اولیں پرسش نماز بود۔'' اور ان فقروں نے وہ زور باندھا کہ دیواروں پر جتنے نئے پرانے اشتہاری اور غیر اشتہاری فقرے لکھے ہوئے تھے وہ سب ماند پڑ گئے۔ حق صاحب نے محض اس پروپیگنڈائی مہم پر قناعت نہیں کی بلکہ چند عملی اقدامات بھی کئے۔ فیصلہ کیا گیا کہ جو شخص مغرب، عشا کی نماز پر مسجد میں نہ پہنچے اس پر چونی جرمانہ کیا جائے، جن اَن پڑھ مسلمانوں کو کلمہ یاد نہیں تھا انھیں کلمہ یاد کرانے کی بھی مہم شروع کی گئی۔ اس کام میں اگرچہ نمبردار صاحب اور حمید ڈاکیہ نے ان کا بہت ہاتھ بٹایا لیکن خود انھوں نے بھی چار پانچ آدمیوں کو کلمہ سکھایا تھا۔ عدم تعاون کی شکایت دراصل انھیں سبطین سے تھی۔ سبطین نے ان کی ہر تجویز پر فقرہ بازی کی اور ہر اقدام کا مذاق اڑایا۔ رفیا کو اگر حق صاحب کلمہ نہ سکھا سکے تو اس میں صرف رفیا کی جہالت کا ہی نہیں سبطین کا بھی قصور تھا۔ رفیا 'لا' تو بری آسانی سے کہہ لیتا تھا، ہاں ذرا 'الہٰ' کے لفظ پر اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔ 'الا اللہ' کی منزل تک پہنچنے کا کبھی سبطین نے ہی موقع نہیں دیا۔ وہ تو بے ساختہ ہنس پڑتا تھا۔ اور رفیا کے آئے حواس گم ہو جاتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ حمید ڈاکیہ کی کوششیں سب سے زیادہ بارآور ثابت ہوئیں۔ اس نے اسٹیشن پر پہنچنا شروع کر دیا۔ اسٹیشن پر جو گاڑی آ کر کھڑی ہوتی وہ مسلمانوں کے کسی ڈبے میں پہنچتا اور لوگوں کو خوفِ خدا سے ڈراتا اور کلمہ سیکھنے کی تلقین کرتا۔ اندھادھند چلتی ہوئی گاڑیوں کے مسافریوں بھی رشد و ہدایت کی روشنی قبول کرنے پر ذہنی طور پر

تیار ہوتے ہیں اور اس زمانے میں تو خیر ہر مسلمان سفر کو زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سمجھتا تھا اور کوفِ خدا سے خود بخود ڈرنے لگتا تھا۔ حمید ڈاکیہ نے سینکڑوں کو کھڑے کھڑے کلمہ سکھا دیا لیکن علّن کی دکان پر اسے سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ علّن کمبخت نے تو ہر ہر قدم پر اتنے سوال اٹھائے کہ حمید کیا کوئی بھی ہوتا اس کے پیر اکھڑ جاتے۔ ہر سوال کا معقول جواب پانے کے بعد بھی اس کی موٹی عقل میں یہ بات نہ آئی کہ آخر اس زمانے میں یکا یک کیوں حق صاحب کو کلمہ سکھانے کا خیال آیا ہے۔ کالے خاں کو جب کلمہ سیکھنے کی دعوت دی گئی تو اس کی اسلامی غیرت ایسی جوش میں آئی کہ اس نے حمید ڈاکیہ کو برملا سنائیں اور علی الاعلان کہا کہ — ''بابو ہمیں کلمہ پڑھانے آیا ہے، اب ہم تجھے الٹا کلمہ پڑھوا دیں گے۔'' کالے خاں کو دعویٰ تو یہی تھا کہ وہ کلمہ جانتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس نے 'مُحمّد رسول اللہ' کو ہمیشہ 'محمد رسول اللہ' کہا۔ اب اس کی زبان کون پکڑتا، اس کے تو ہاتھ تک پکڑنے مشکل ہوتے تھے۔ شیرو سے جب کلمہ سیکھنے کو کہا گیا تو پہلے تو وہ حمید ڈاکیہ کو وحشیانہ انداز میں گھورتا رہا۔ پھر بولا — ''یاد ہے۔ جا اپنے وکیل صاب سے کہہ دیجو کہ شیرو کو کلمہ یاد ہے۔'' اور یہ فقرہ اس نے ایسے قطعی انداز میں کہا کہ حمید ڈاکیہ کو کچھ اور پوچھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔

علّن کی دکان پر بیٹھنے والے دراصل کسی اور ہی فکر میں گرفتار تھے۔ ذریعہ کا حال اللہ بہتر جانتا ہے لیکن خبریں پل پل کی یہاں پہنچتی تھیں۔ یہ خبر مٹھوا بننے والے نے اڑائی تھی کہ جنرل موہن سنگھ کی فوجوں نے پنجاب فتح کر لیا۔ علّن اس خبر کو جھٹلا تو نہیں سکتا تھا لیکن اس کا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ یہ خبر غلط ہے۔ کالے خاں کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ رفیا کی بھی سٹی گم تھی۔ لیکن آخر اس طلسم کو پھر رفیا نے ہی توڑا۔ یہ خبر اسی نے آ کر سنائی تھی کہ گاما اپنے پٹھوں کو لے کر امرتسر سے نکل پڑا ہے۔ پھر کیا تھا، سوکھے

دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔ کالے خاں مر کے جی اٹھا۔ لیکن علن کو ابھی اچھی طرح یقین نہیں آیا تھا۔ جب رفیا نے اسے بتایا کہ گاما اور جنرل موہن سنگھ کا ایک ایک پانی بھی ہو چکا ہے اور جنرل موہن سنگھ نے دو فائر کئے اور دونوں گاما نے اپنے سینے پہ روک لئے تو علن کو پھر اس واقعہ پر ایمان لانا ہی پڑا۔ مٹھوا بننے والا تو کسی طرح اسے سچ مانتا ہی نہ تھا لیکن جب اس نے لڑائی کی تفصیلات سنیں تو اسے سوائے یقین کر لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ البتہ اسے یہ سن کر بہت سکون ہوا کہ جنرل موہن سنگھ گاما کی مار سے بچ نکلا ہے۔ اس کا افسوس سب سے زیادہ کالے خاں کو تھا۔ لیکن رفیا نے اسے اطمینان دلا دیا کہ ''کالے خاں میں بو کو ہوں کہ سالا بچ کے کہاں جائے گا۔'' مٹھوا کی کئی دن تک بری حالت رہی لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ پٹیالہ والے کی فوج بگڑ کر نکل کھڑی ہوئی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے تو اس کے چہرے پر پھر تازگی آ گئی۔ علن پنواڑی کی دکان پر جب یہ خبر پہنچی تو ایک دم سے سب پہ اوس پڑ گئی۔ مٹھوا کی بات پر تو کیر کبھی بھی یقین نہیں کیا گیا۔ لیکن اس خبر کے راوی تو لالہ رگھو بر دیال تھے۔ حق صاحب خود اپنے کانوں سے ان سے یہ سن کر آئے۔ ایسی صورت میں یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کئی دن اور کئی راتیں بڑے کرب کے عالم میں گزریں۔ خبریں آتے آتے ایک دم سے بند ہو گئیں۔ ہر شخص پریشان تھا۔ کسی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ آخر اس تذبذب کو ختم کرنے کا سہرا پھر رفیا ہی کے سر رہا۔ اس نے علن کی دکان پر پہنچ کر بڑے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔ ''لو میاں دس سالے پٹیالہ والے کا تو کباڑا ہو گیا۔''

سب کے سب چونک پڑے، ''کیسے؟''

رفیا نے پڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ — ''اجی سالا پٹیالے والا عقلمند بنے تھا، مگر حیدر آباد کے نواب نے بھی نہلے پہ دہلا مارا۔ سب دھری رہ گئی سالے کی چالاکی۔''

حیدر آباد کے نواب کے حوار نے ستم ڈھایا لوگوں کے اشتیاق میں دوگنا چوگنا اضافہ ہوگیا۔ کئی آوازیں ایک ساتھ نکلیں — ''یار بتا نا کیا ہوا؟''

رفیا بڑے اطمینان سے بولا — ''ہاں ہاں یار بتاؤں ہوں۔ ابے او علن مرغی والے کبھی کبھی تو اپنے داداؤں کو بیڑی پلا دیا کر۔''

رفیا نے بروقت سوال ڈالا تھا۔ علن نے جھٹ پٹ بیڑی نکال اسے تھمائی۔ رفیا منھ سے بیڑی لگاتے ہوئے بولا — ''میاں میں بھی تو کہوں کہ حیدر آباد کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ مگر وے بھی موقعہ کی تاک میں تھا۔'' یہ کہہ کے اس نے بڑے آرام سے بیڑی سلگائی۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ لیکن رفیا نے ان کے اشتیاق اور ان کے اضطراب کا احترام کچھ ایسا ضروری نہ سمجھا۔ بیڑی سلگانے کے بعد اس نے ایک زور کا کش لیا اور کہنے لگا — ''سالے پٹیالے والے نے چال چلی تھی کہ میری فوج مجھ سے بگڑ گئی حیدر آباد کا نواب کہاں چوکنے تھا۔ اس نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میری ایک پلٹن باغی ہوگئی ہے۔''

''اچھا۔'' سب کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔'' رفیا بولا، ''اب رہے گی برابر کی چوٹ۔''

''برابر کی چوٹ؟'' کالے خاں کے لہجہ میں ایک حقارت کا پہلو بھی تھا۔
''بھتنی کے باولا ہوا ہے۔ حیدر آباد تو منٹوں میں پٹیالہ کی فوج کو چُر مُر کر دے گا۔''
دراصل کالے خاں بہت آگے نکلا جا رہا تھا۔ علن ابھی پہلی ہی منزل میں تھا۔

اس نے کالے خاں کی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں بے رفیا یہ خبر اخبار کی ہے؟''

''سن رہے ہو جی اس سالے کی باتیں۔'' رفیا پورے مجمع کی عقل سے خطاب کر رہا تھا۔ ''اے گھاس کھا گیا ہے ایسی خبریں کہیں اخباروں میں آسکیں ہیں۔ حیدر آباد سے سپّو میاں کا ایک دوست آیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ جھوٹ مانے تو جا کے سپّو میاں سے پوچھ لے۔''

کالے خاں بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''مگر یار وو ے حیدر آباد کی پلٹن کدھر گئی ہے؟''

رفیا نے ہر سوال کا بے ساختہ جواب دینے کا تہیہ کیا تھا۔ مگر اس سوال پہ سٹپٹا گیا۔ لیکن یہ سوال اکیلے رفیا سے نہیں تھا۔ سب ہی کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ علّن اس انداز میں سر کھجا رہا تھا گویا اس معمہ کو سلجھانے کی ساری ذمہ داری اسی کے سر ہے۔ بہت سوچ ساچ کر بولا ''پہلے تو امرتسر کی طرف جائیں گی۔''

''ہوں۔'' رفیا بولا۔ ''اب تک امرتسر ہی میں بیٹھی ہیں۔ میاں اب تو دلّی کو چل پڑی ہوں گی۔''

شیرو پہلے ٹکٹکی باندھے علّن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر رفیا کے چہرے پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ کالے خاں بھی کچھ کہنے کی نیت باندھ رہا تھا لیکن شیرو کو جانے کیا ہوا، بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کالے خاں کے دل کی بات دل ہی دل میں رہ گئی۔

مٹھوا کو جب یہ پتہ لگا کہ حیدر آباد کی ایک پلٹن امرتسر پہ جا ٹوٹی ہے تو اس کے تو حواس باختہ ہو گئے۔ اسی عالم میں یہ خبر پہنچی کہ ہندوؤں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی

ہے۔ راجپوتوں نے تلواریں سونت لی ہیں اور جاٹ کہتے ہیں کہ دلّی سے لے کر میرٹھ تک ہم اپنی حکومت قائم کریں گے۔ مٹھوا کا منھ اتنا سا نکل آیا۔ جب دلّی سے گڑبڑ کی خبریں آئیں تو وہ مطلق یہ نہ سمجھ سکا کہ جاٹوں نے دلّی پر حملہ کیا ہے یا راجپوتوں نے ہلّہ بولا ہے۔ یہ انکشاف رفیا نے کیا تھا کہ لڑائی ہندو مسلمانوں میں ہوئی ہے۔ یہ بھی اسی نے سنایا تھا کہ پہلے دن تو مسلمان بہت پٹے، لیکن دوسرے دن میواتیوں نے ہلّہ بول دیا اور پورے کانٹ پلیس میں آگ لگا دی۔ پشاور سے پٹھانوں کے چل پڑنے کی خبر کون لایا اور کہاں سے لایا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کم از کم رفیا تو اس کا راوی نہیں بنا۔ اور مٹھوا سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی کون مارتا ہے۔ اس خبر سے اس کے تو پیٹ میں درد ہونے لگا۔ کالے خاں کا دماغ عرشِ معلیٰ پر تھا۔ اب تو وہ کالے آدمی سے بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ علّن نے ذرا قنوطیت کا مظاہرہ کیا۔ کہنے لگا— ''اماں بات یہ ہے کہ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہووے ہے پٹھانوں کی دلّی میں دال نہیں گلے گی۔''

اس پر کالے خاں بہت بگڑا— ''لو اس بھتنی والے کی سنو۔ ابے پٹھان جہاں گئے جھنڈے گاڑ دیے۔ میاں میں نے لڑائی میں یہ دیکھا کہ جہاں لڑا پٹھان لڑا۔ سالے گورے تو لونڈیوں کو پٹاتے پھرے تھے۔ میں تو یہ کہوں ہوں کہ اگر پٹھانوں کی پلٹن نہ ہوتی تو اس لڑائی میں انگریزوں کا ڈبہ گول تھا۔''

انگریزوں کی تذلیل پر علّن بہت کھلا۔ بولا— ''یار انگریز کی بات مت کر، ؤس کا اور پٹھان کا کیا مقابلہ۔''

''لو بولو۔'' کالے خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''یہ نکیا چوٹے سالے انگریز پٹھانوں کا مقابلہ کریں گے۔ میاں وے تو تکڑم لڑاوے ہیں۔ پٹھان لڑتا ہے۔

ون سالوں نے خود مانا ہے کہ ہاں بھئی لڑائی میں پٹھانوں نے بڑی بہادری دکھائی۔''

''دل بڑھانے کو کہہ دیا ہوگا۔'' علّن نے بے ساختہ جواب دیا۔

کالے خاں اور بھن گیا— ''لو جی یہ چوٹی والے پٹھانوں کا دل بڑھائیں گے۔ ؤن کا دل تو خود قبوتری کا سا ہے۔''

رفیا بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ بات کاٹتے ہوئے بولا— ''کالے خاں چھوڑ بھی کس کے منہ لگے ہے۔ میں یہ کہوں اوں کہ دیر کون سی ہے۔ اب پٹھان آئے دیکھ لینا کیا ہوئے ہے میاں جب وہ دعا دغا کرتے آئیں گے تو سکھوں اور جاٹوں کی تو میا مر جائے گی۔''

علّن نے طنزاً جواب دیا— ''ہاں جی چٹکیوں میں دتی فتح کرلیں گے۔''

''پیارے دیکھتا رہ۔ لال قلعہ پہ....''

''ابے یار گولی مار لال قلعہ کو۔ ذرا بیری تو پلا۔'' شیرو بھی خاموش بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ رفیا نے کوئی بہت طنطنہ کا فقرہ کہنے کی نیت باندھی تھی مگر شیرو نے ٹنگوی مار دی۔ اس نے کان میں لگی ہوئی بیڑی نکال کر جلدی سے شیرو کے حوالے کی۔ یہ عجلت اس نے شاید اس لئے برتی تھی کہ وہ اپنی بات پھر شروع کر دینی چاہتا تھا۔ لیکن شیرو نے اسے موقعہ ہی نہیں دیا۔ اس نے بیڑی منہ سے لگاتے ہوئے کہا— ''سالو بہت دون کی لے رئے ہو۔ یہ بتائے دوں ہوں....'' یہ کہتے کہتے وہ علّن سے مخاطب ہو گیا۔ ''ابے علّن دیا سلائی دیجو بے۔'' علّن نے اسے دیا سلائی کی ڈبیا دے دی اور ساری نگاہیں شیرو کے چہرے پر جم گئیں گویا وہ کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ شیرو نے اطمینان سے بیڑی سلگائی اور دیا سلائی کی بجھی ہوئی تیلی پھینکتے ہوئے بولا، ''بچو یہ بتائے دوں ہوں بڑا خون خرابا ہوگا۔''

چند لمحوں کے لئے سکوت چھا گیا۔ پھر کالے خاں تڑپ کر بولا— ''خون خرابا تو ہوگا۔ تو جورو کے پاس دبک کے بیٹھ جائیو۔''

رفیا نے ٹکڑا لگایا— ''ابے یار کالے خاں امرتسر والوں سے تیری تو یاری ہے، وہیں لکھ بھیج کہ لاہور کو اتنی چوڑئیں بھیج دیں دو چوڑئیں ادھر بھی بھیج دو۔''

شیرو نے کالے خاں اور رفیا دونوں میں سے ایک کے فقرے کا بھی اثر قبول نہیں کیا۔ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ بولا— ''بس ہم نے تمھیں بتا دیا ہے۔''

اور شیرو پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ آخر کوئی ایک منٹ کے بعد علّن بولا— ''یار یہ شیرو تو منھ زوری کیا کرے ہے۔''

کالے خاں بولا— ''یہ سالا پٹھانوں کو نہیں جانتا۔'' اور اس کے بعد اس نے پٹھان رجمنٹ کی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیے۔ پھر رفتہ رفتہ رفیا نے یہ محسوس کیا کہ کالے خاں کا جوش دھیما پڑتا جا رہا ہے۔ اس نے بڑی عقلمندی سے گفتگو کا ذمہ اپنے سر لے لیا اور سبطین کے علم و فضل کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ پھر نا معلوم کس وقت اور کس طرح پٹڑی بدلی اور گفتگو کا موضوع سبطین کی بجائے حق صاحب اور نمبردار صاحب بن گئے۔

رفیا کہہ رہا تھا— ''یار مجھے تو اس پہ آوے ہے کہ وکیل صاب کو کلمہ خود نئیں آتا اور دوسروں کو سکھاتے پھرے ہیں۔''

''یہ میں نئیں مانتا۔'' علّن نے فوراً اس کی تردید کی۔ ''میاں آخر کو تو وہ وکیل ہے اور پھر وس کی اتنی عمر ہے۔ تجھ سے تو وہ دوگنا تگنا بڑا ہوگا۔ سر کے بال کھچڑی ہو رئے ہیں اور کلمہ وسے یاد نہ ہوگا؟''

''بھئی قسم اللہ پاک کی وسے کلمہ نئیں آتا۔ میاں میں تو بالکل ٹھیک کلمہ پڑھوں

اور وہ ہر مرتبہ ٹوک کے وسے غلط کر دے۔"

"حد ہے یار۔" کالے خاں بولا۔

کالے خاں کی تائید حاصل ہوئی تو رفیا نے اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ "میرے تو جی میں آئی کہ کہہ دوں کہ وکیل صاب پہلے خود کلمہ سیکھ لو۔"

علّن رفیا کا فقرہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "پر مجھے تو ہنسی نمبر دار پہ آوے ہے۔ وہ بھی کلمہ سکھاتا پھرے ہے۔"

کالے خاں نے فوراً اعتراض کیا۔ "ہنسنے کی کیا بات ہے بے۔ کلمہ ہی تو وہ سکھلاوے ہیں۔"

"لو جی ہنسنے کی بات ہی نئیں اے۔" علّن تاؤ میں آ کر بولا۔ "اماں محلّہ بھر کا تو وہ محصول ہضم کئے بیٹھا ہے۔ قسم کلمے محمد کی ڈکار نئیں لیتا سالا۔ فر سود پہ روپیہ چلاوے ہے۔ خود سود کھاوے ہے، دوسروں کو کلمہ...۔"

شیرو پھر چونکا اور علّن کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "علّن میری بیڑیوں کا حساب کتنا ہوا؟"

"بڑا حساب کا چوکھا بن را ہے بے۔" علّن چمک کر بولا۔ "انٹی سے پیسہ نکلتا نئیں حساب پوچھے ہے۔"

"تو حساب تو بتا۔"

"بتا دوں گا پہلی کو۔ ابھی کیا تو دے رہا ہے۔"

"نئیں بے حساب بیباق کر لے۔ کل میں جا را ہوں۔"

"کہاں جا رہا ہے بے؟ لام پہ جائے گا؟"

رفیا نے فوراً بات کاٹ دی۔ "لام پہ جاوے گا بھڑوا، یاں سے ڈر کے

جارا ہوگا۔''

علّن نے پھر اصرار سے پوچھا— ''کہاں جارہا ہے بے؟''

''دلّی۔''

''دلّی؟''

''ہاں دلّی...دلّی۔'' شیرو نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

کالے خاں کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ رفیا نے کئی مرتبہ بولنے کی ہمت کی لیکن اسے کوئی بات بن ہی نہ پڑی۔ آخر پھر علّن ہی بولا— ''کیوں جارا ہے بے؟''

''تو پان بیڑی بیچ، تجھے اس سے کیا مطلب۔'' اور یہ کہہ کے شیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے وہ پھر بولا، ''میرا حساب دیکھ رکھیو۔ صبح کو آؤں گا میں۔'' اور یہ کہہ کے شیرو اپنی لاٹھی پٹخاتا گھر کو چل دیا۔

کالے خاں کا منھ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ رفیا پر سکتہ کی کیفیت طاری تھی۔ علّن نے خواہ مخواہ پانوں پر پانی چھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

— • — • —

دلّی

۱۷/اگست

بڑی مشکل سے پاؤں ٹکانے کی جگہ ملی ہے۔ اسے مکان کہنا تو کچھ مبالغہ ہی ہوگا، پاؤں ٹکانے کی جگہ ہی کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلّی میں رہنے کو جگہ مل جاتی تھی۔ کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اب یہ زمانہ ہے کہ یہاں نوکری مل جاتی ہے مکان نہیں

ملتا۔ میں تو اس پر حیران ہوں کہ یہاں سے روز مسلمانوں کے قافلے پاکستان روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کسی مسلمان محلّہ میں کوئی مکان خالی نظر آ جائے۔ مکین تو پاکستان چلے جاتے ہیں مگر مکان کہاں جاتے ہیں۔ روز میلہ ڈہلتا ہے، جسے دیکھو ٹانڈا بانڈا سنبھالے چلا جا رہا ہے۔ پوچھو کہ حضرت کدھر کو۔ جواب ملے گا ''میاں دلّی میں رہنے کا دھرم نہیں رہا۔ پاکستان جاتے ہیں۔'' اسٹیشن پر جا کر دیکھئے تو عجب منظر نظر آئے گا۔ یوں نظر آئے گا کہ ساری دلّی اسٹیشن پر ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر محلوں میں جا کر دیکھئے تو مکان بدستور گھرے ہوئے ہیں یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے یا تو دلی والے ہی سلیقہ سے دلّی خالی کر رہے ہیں یا پھر ہمیں مکان حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ بہر حال ہم یہیں ہیں اور دلّی کے مسلمانوں کو پاکستان جانا ہے۔ کبھی تو ٹھکانے کا مکان ملے گا ہی۔

۲۰/اگست

اب تک تو میں مکان کی فکر میں سرگرداں رہا تھا۔ مدرسہ کی حالت پر نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ خدا خدا کر کے اب اس طرف سے سکون ہوا ہے سو مدرسہ کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ دراصل میں کچھ ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند ہو گیا تھا۔ مدرسہ اسلامیہ والوں کے دعوے ہی دعوے تھے اس میں اور دوسری درس گاہوں میں مجھے کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ مدرسہ والوں نے اپنے طرزِ تعلیم میں ایک یا پن پیدا کرنے کی بڑی بھلی کوشش کی ہے مگر یہ نیا پن ایسا نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ہندی مسلمانوں کی نئی پود میں کسی زبردست ذہنی انقلاب کی توقع کی جا سکے۔ رہا طلبا کا معاملہ تو ان میں بھی مجھے کوئی خاص چمک نظر نہیں آتی۔ دلی کے ہم نے بہت ذکر اذکار سنے تھے۔ لیکن اب چکھا تو پتہ چلا کہ اس اونچی دکان کا

پکوان بھی خاصا پھیکا ہے۔ علی گڑھ کے لڑکوں اور دلّی کے نوجوانوں میں مجھے اس کے سوا اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ موخر الذکر اردو اچھی بولتے ہیں۔ یہ امتیازی صفت ہے کوئی وصف تو نہیں ہے۔

بہرحال میں تو یہاں آ ہی پڑا ہوں۔ علی گڑھ کے تالوں کے کاروبار سے یہ صورت بہر صورت بہتر ہے۔ وہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور کیوں ہوتا وہاں کی فضا تو خالص نعروں کی فضا ہے۔ علی گڑھ کے یتیم الفکر طلبا کو سوچ بچار سے کیا واسطہ۔ یہاں میں نوجوانوں تک کم از کم اپنی بات تو پہنچا ہی سکتا ہوں۔

۲۲/اگست

دلّی خوب شہر ہو یا نہ ہو عجیب شہر ضرور ہے۔ معلوم نہیں لوگ باگ کیوں اس شہر کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے۔ مجھے تو یہاں وحشت ہوتی ہے۔ یہاں کے درو دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ میں اس شہر میں نیا نیا ہوں یا پھر واقعی یہاں کی فضا وحشت خیز ہے۔ یہاں کے بازاروں مین عجیب ہنگامہ نظر آتا ہے۔ دلّی کے شائقین شاید اسی ہنگامے کو چہل پہل بتایا کرتے تھے۔ مگر مجھے تو یہ سراسر سراسیمگی کا طوفان نظر آتا ہے۔ یہاں کے بازاروں میں چلتے ہوئے میں جس صورت پر نظر ڈالتا ہوں۔ اس پر یا تو وحشت برستی نظر آتی ہے یا ڈراؤنی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ایک عجب بات یہ ہے کہ یہاں کی راتیں مجھے بڑی ڈراؤنی معلوم دیتی ہیں۔ علی گڑھ کی تخصیص نہیں، میرا ہر جگہ یہ طور رہا کہ رات رات بھر سڑکوں پر گھومتا تھا اور علی گڑھ کی تو خیر بات ہی نرالی تھی۔ نہ جانے وہاں میری کتنی راتیں سڑکوں پر گھومتے کٹی ہیں۔ علی گڑھ کے پنواڑی کاصے زندہ دل تھے۔ رات گئے تک دکانیں کھولے رکھتے تھے اور پھر وہاں کا اسٹیشن تھا جو دن سے زیادہ رات کو آباد نظر آتا تھا۔ مگر

یہ دلّی عجب شہر ہے۔ شام سے شہر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ سڑکیں ہُو حق کرتی ہیں۔ فضا سائیں سائیں کرتی ہے۔ اکثر یوں ہوا ہے کہ میں چلتے چلتے خود اپنے قدموں کی چاپ پر چونکا ہوں۔ ایک چیز جو مجھے یہاں بہت چونکاتی ہے۔ وہ کتوں کا رونا ہے۔ کتے راتوں کو ہر جگہ روتے ہیں۔ علی گڑھ میں بھی روتے تھے، حسن پور میں بھی روتے تھے، مگر دلّی کے کتے کچھ اتنی درد انگیزی سے روتے ہیں کہ دل خواہ مخواہ دھڑ کنے لگتا ہے۔ کئی مرتبہ میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب سوال پیدا ہوا کہ دلّی کے کتوں کی آواز میں اتنا سوز کیوں ہے اور راتوں کو ان پر غیر معمولی حد تک رقت کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا بے ڈھنگا سوال ہے اور مجھ جیسے بے ڈھنگے آدمی کا الٹا دماغ ہی ایسے سوال کو جنم دے سکتا ہے۔

۲۳/ اگست

آج شام کو میں بہت دیر تک چاندنی چوک میں گھومتا رہا۔ اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھا۔ ایک سے ایک اچھی صورت نظر آئی۔ دلّی کا پانی جو کسی زمانے میں بہہ کر ملتان چلا گیا تھا۔ شاید اب بہہ کر دلّی واپس آ رہا ہے۔ میرے لئے تو خیر یہ شہر نیا ہے۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دلّی میں رنگ و نور کی ایسی فراوانی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ چاندنی چوک واقعی چاندنی چوک بن گیا ہے۔ چاندی صورتوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ ہر ہر قدم پر ایمان و آگہی کی بازی لگانے کو جی چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لاہور تو اب چونڑی ہوئی امبیا بن کر رہ گیا ہوگا۔ پاکستان اچھا بنا لاہور کا پانی دلّی کے بازاروں میں بہا بہا پھرتا ہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود دلّی ویران سی نظر آتی ہے۔ چاندنی چوک کف گلفروش بنا ہوا ہے۔ پھول تازہ بھی ہیں، خوش رنگ بھی ہیں۔ پھر یہاں کی

فضا کیوں اتنی ویران نظر آتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کہیں یہ اپنے ہی دل کی خانہ ویرانی تو نہیں ہے۔

۲۴ / اگست

رات بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ پھر بھی منہ اندھیرے آنکھ کھل گئی۔ کلی کی، منہ پر دو چھپاکے مارے اور گھر سے نکل پڑا۔ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے میں عجب لطف آتا ہے۔ مگر یہ دلی عجب بے لطف جگہ ہے۔ پر لطف چیزوں میں بھی لطف نہیں آتا۔ دلی کی صبح عجب ملگجی سی ہوتی ہے۔ گھومتا گھامتا جمنا گھاٹ کی طرف نکل گیا۔ وہاں جا کر بھی طبیعت ہری نہ ہوئی۔ جمنا بہتی تو کیا ہے بس اونگھتی ہے۔ ایسے نرم رو پانی کو دریا کہنا مجھے تو کچھ زیادتی سی لگتی ہے۔ میں نے جنوبی ہند کے دریا دیکھے ہیں۔ کس زور شور سے بہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی ساری چٹانوں کو بہا کر لے جائیں گے۔ دراصل مجھے نرم گرم اور سست رو چیزوں کو دیکھ کر کچھ خفقان سا ہوتا ہے۔ میں تو ہنگامہ اور حرکت چاہتا ہوں۔ سبطین کی جس بات پر مجھے غصہ آتا ہے وہ اس کے مزاج کا دھیما پن ہے۔ وہ سوائے خواب دیکھنے کے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ مگر خواب ایسے بھی تو ہو سکتے ہیں جن میں سمندروں کا شور ہو۔ اس بھلے آدمی کے تو خواب بھی ادھ مرے ہوتے ہیں۔ اس سے اچھا تو اس کا ملازم رفیا ہے اور کچھ نہ سہی اس کی آواز میں گرمی تو ضرور ہے۔ سبطین تو نرا بجھا ہوا انگارہ ہے۔ میں نے اسے ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے کہ کسی لڑکی سے محبت کرو۔ بس وہ محبت ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی لڑکی سے، عورت سے نہیں۔ عورت سے لڑکے نہیں مرد محبت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سبطین کے گھر کے سامنے والی کا کیا حال احوال ہے۔ سبطین اسے عورت بتاتا تھا۔ اس کی سوجھ بوجھ پہ مجھے اعتبار تو ہے نہیں مگر وہ غالباً عورت ہی ہوگی۔ اس کا طور یہی بتاتا تھا۔ جی میں آتا

ہے کہ ایک روز کے لئے حسن پور جاؤں اور اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی خوبصورت نہیں ہوگی مگر اس میں ایک ٹھستا ضرور ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہو۔ آج کل تو جس کے متعلق سوچئے وہ خندق کے پار ہی نظر آتا ہے۔ لوگ اچھے خاصے ملتے ہیں، علیک سلیک ہوتی ہے، موسم کے حال پہ گفتگو ہوتی ہے، دوسرے دن ان کی خیر و عافیت پوچھئے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو پاکستان گئے۔ تو کیا عجب ہے کہ وہ بھی پاکستان چل دی ہو۔ مگر مارو گولی۔ میں اس کے بارے میں سوچ کیوں رہا ہوں۔ مجھے اس سے کون سی محبت کرنی رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ عورت ہے یا لڑکی تو اس کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اگر سبطین کا اس سے عشق ہو گیا تو وہ لڑکی ہے ورنہ عورت۔

۲۶/ اگست

میں اس شہر کو جتنا دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ مجھے یہ عجیب نظر آتا ہے۔ آج مدرسہ کی چھٹی تھی۔ میں حوض قاضی کی رف نکل گیا۔ وہاں کی گلیوں میں بہت دیر تک بے مقصد گھومتا رہا۔ پھر چاوڑی ہوتا ہوا کوچہ چیلان میں نکل گیا۔ کوچہ چیلان کوچہ ہے یا شیطان کی آنت ہے۔ گلیاں شوشوں کی طرح نکلتی ہی چلی گئی ہیں۔ خیر مجھے تو گھومنے سے مطلب تھا۔ مسلمان محلوں کا عجب عالم ہے۔ جتنے مکان ہیں اتنی کبوتروں کی چھتریاں ہیں۔ اگر اوپر سے کوئی دلی کو دیکھے تو ساری فضا میں مسجد کے میناروں اور کبوتروں کی چھتریوں کا ایک جال تنا ہوا نظر آئے گا۔ جامع مسجد کے سامنے جسے دیکھو مٹھی میں کبوتر دبائے پھرتا ہے۔ جس کی مٹھی میں کبوتر نہیں اس کے ہاتھ میں لالوں کا پنجرا ہوگا۔ مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر طبیعت بہت منغض ہوئی۔ سوچا تھا کہ چاندنی چوک چلو، طبیعت اور سی ہو جائے گی۔ ابھی یہاں قدم ہی رکھا تھا کہ

ایک بزرگ ایک شہدے سے مصروفِ گفتگو نظر آئے۔ میں ٹھٹک گیا۔

کہہ رہے تھے۔۔ ''اماں خلیفہ جی! یہ بئے کا بچہ کیا لئے پھرتے ہو؟''

شہدے کی مٹھی میں ایک سفید کبوتر دبا تھا۔ اس فقرے کو سن کر گرم ہوا بولا۔۔

''خان صاحب ہم نے بئے کے بچے پالے ہیں۔ کبھیوں قبوتر نئیں دیکھا۔''

خان صاحب ٹھنڈے پڑ گئے۔ کہنے لگے۔۔ ''تو میں نے کہا پہلوان دکھاؤ نا۔''

شہدا اور چڑھ گیا۔۔ ''اماں تمھارے مطلب کے بھی میں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اپنا وے لمڈا ہے نئیں کنجی آنکھوں والا وس کے چوبارے پہ کسیوں دن آ جانا۔ دے دوں گا کوئی سستے داموں کا قبوتر پر اس وقت تو قیمتی قبوتر ہے اپنے پاس۔''

خان صاحب گرما گئے۔۔ ''اماں خلیفہ صورت دیکھ کے بات کیا کرو۔ میاں ہم نے تو پیسے کو ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا۔ سوئیوں والے محلّہ میں دکانوں کی لین کی لین تھی۔ سب قبوتروں اور شطرنج پہ ہی بھینٹ چڑھائی۔ وہ چھنگا پہلوان ہے ناؤس کے جو گئے پہ دل آ گیا۔ وُس نے کہا کہ اپنی کالے آموں والی بغیا دے دو۔ ہم بھی ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔ قسم قبلہ شریف کی فوراً قبالہ لے لیا۔ تو میاں ایجانب سے ذریوں سنبھل کے بات کیا کرو۔ لاؤ دکھلاؤ دیکھیں کہ کس برتے پہ اینٹھ رئے اوَ۔''

خلیفہ خان صاحب کے ہاتھ میں کبوتر تھماتے ہوئے بولا۔۔ ''خان صاحب لوٹن ہے لوٹن ذریوں وے چھوڑو فر دیکھو کمال۔ قلابازئیں کھاتا ہوا آسمان پہ جاوے گا۔''

خان صاحب نے اس کی بات فوراً کاٹ دی۔۔ ''اماں ہمیں نٹ کا تماشہ تھوڑائی کرنا ہے قبوتر اڑانا ہے۔''

خلیفہ ہار ماننے والا کب تھا۔ بولا۔۔ ''اڑان کی تو یہ سن لو کہ فجر کو دانہ کھلا کے

اڑا دیجو، چوبیسوں گھنٹے اڑے گا اور رات میں بس کے دوسرے دن فجر کو چھتری پہ گرے گا۔ کان صاحب وُس کی چونچ دیکھو چونچ۔''

خان صاحب نے چونچ دیکھی۔ پھر پنجوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے بازوؤں کو پھیلا کر دیکھا اور بولے۔۔۔ ''ہاں تو پہلوان بتا دو ٹھیک ٹھیک۔''

خلیفہ تن گیا۔۔۔ ''خان صاب دلّی میں کوئی اس کا جوڑ نکال کے دکھاوے تو وُس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل جاؤں گا۔ اماں اتفاق ہے۔ نکھلئو میں ایک نواب صاب ہیں۔ ہمارے سالے سے ون کی تو تکار ہے۔ پچھلے پندرواڑے وے نکھلئو گیا تھا وِنھوں نے وسے یہ قبوتر دے دیا....''

معلوم نہیں آگے اور کیا گفتگو ہوئی۔ اس فضول گفتگو سے مجھے ایسی کوفت ہوئی کہ فوراً ہی میں آگے بڑھ گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ وہی دلّی ہے جسے شاہجہاں نے آباد کیا تھا۔

۲۷/ اگست

کچھ بھلا سا نام تھا اس محلّہ کا۔ دلّی کے محلوں کے نام بھی تو کچھ عجیب سے ہیں۔ بہر حال وہ کوئی محلّہ تھا۔ ایک مکان پر میں نے ایک بورڈ لٹکا دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔۔۔ ''یہاں بارات کے لئے گھوڑے کرائے پر ملتے ہیں۔''

یہ بورڈ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ ہنسی اس پر آئی کہ دلّی والے عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھوڑے پہ چڑھ لیتے ہیں اور رنڈوؤں کو دوسری مرتبہ بھی یہ شرف حاصل ہو جاتا ہوگا۔ تعجب اس پر ہوا کہ دلّی سے گھوڑے ابھی تک ناپید نہیں ہوئے ہیں اور باراتوں کے لئے ہی سہی گھوڑے مل ضرور جاتے ہیں۔

وہ سوال جو کل میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا آج پھر کروٹ لے رہا ہے۔ کیا یہ

وہی دلّی ہے جسے شاہجہاں نے آباد کیا تھا اور کیا یہ وہی دلّی ہے جس کی سڑکیں آج سے سو سال پہلے بخت خاں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی تھیں۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب تو دنیا سے اٹھ ہی گئے۔ لیکن کیا کوئی بخت خاں بھی اب باقی نہیں ہے؟

۲۸ / اگست

آج لال قلعہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ چار بجے مدرسہ سے چھوٹا اور سیدھا قلعہ کی طرف چلا۔ قلعہ یہاں سے خاصے فاصلہ پر ہے اور پھر یوں بھی میں پیدل چلنے کا قایل ہوں۔ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ قلعہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ میں وہاں سے ایڈورڈ پارک پہنچا اور سبزے پر لیٹ گیا۔ ایک چمپی والا میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے پھٹکار دیا۔ یہ چمپی بھی عجب مذاق ہے۔ آدمی اچھا خاصا گڈا سا لگنے لگتا ہے۔

جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ دور سے کسی مندر کے گھنٹے کی آواز رک رک کر بڑے باوقار انداز میں آرہی تھی۔ جامع مسجد سے اذان کی آواز کچھ یوں بلند ہورہی تھی جیسے کوئی نوحہ پڑھا جارہا ہو۔ قلعہ کی دیواریں چپ چاپ کھڑی تھیں اور اس کی برجیوں اور کنگروں پر اندھیرا اپھیل رہا تھا۔ میں لیٹے لیٹے وقت کی نیرنگی پر غور کرنے لگا۔ زندگی کے کیسے کیسے پرشوکت مظاہرے اس کے ایک اشارے پر افسانہ وافسوں بن کر رہ جاتے ہیں۔ شاہجہاں کے وقت میں بھلا کس کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ قلعہ کی فضا کی یہ ساری گہما گہمی یہ سارا ہنگامہ ایک روز موت کے سناٹے میں غرق ہو جائے گا اور خود لال قلعہ ایک خاموش مرثیے کی شکل اختیار کر لے گا۔ آج سے سو سال پہلے اس برعظیم کے گوشہ گوشہ سے یکا یک ایک شور اٹھا اور اس شور کی دھمک سے اس قلعہ کے در و دیوار ہل گئے۔ پھر یہ شور ختم گیا اور ایسا تھما کہ لال قلعہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، گنگ ہوگیا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ خاموشی ایک مرتبہ پھر ٹوٹے۔ کوئی کالے خاں ایک مرتبہ پھر اس قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہو کر گولے پھینکے اور جمنا کے خاموش پانی میں شور پیدا کرے۔ مگر اس شہر میں اب کالے خاں اور بخت خاں کاہے کو پیدا ہوں گے یہاں کے خان اور خلیفہ تو کبوتر اڑانے کو زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ سمجھتے ہیں۔

شام کے جھٹپٹے میں یوں بھی فضا میں ایک سوز ایک درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آس پاس کوئی تاریخی کھنڈر ہو تو اس سوز میں دوگنا چوگنا اضافہ ہو جاتا ہے اس وقت لال قلعہ کو دیکھ کر مجھ پر وہ کیفیت گزری جو چاند کو گہناتے دیکھ کر گزرتی ہے۔ چاند گہن میں تپش سے زیادہ سوز کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ ایک کربناک کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں آواز نہیں ہوتی۔ ارتعاش نہیں ہوتا۔ اس وقت میری آنکھوں میں جھٹپٹے میں ڈوبے ہوئے وہ لال قلعہ کے در و دیوار پھر رہے ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ چاند آسمان پر خاموشی سے کرب کے عالم میں گہناتا چلا جا رہا ہے۔

۲۹/ اگست

اب تو دلّی کی فضا میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ راتوں کو گھومنے کا سلسلہ اب تقریباً بند ہو چلا ہے۔ سپاہی قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ دن میں گھومنے کی اس لئے فرصت نہیں ملتی کہ مدرسہ میں سر جھکانا پڑتا ہے۔ آج چھٹی تھی۔ میں مہرولی کی طرف چل نکلا۔ معلوم نہیں کیوں آج مجھے دلّی میں پہلی مرتبہ بس میں سوار ہونے کا خیال آیا۔ مگر پھر میں اس خواہش پر غالب آ گیا۔ اپنی ٹانگوں میں بھی دم ہے اور ٹانگوں میں دم ہوتے ہوئے بس اور ٹرام کی سواری کی تُک میری سمجھ میں نہیں آتی۔

حضرت نظام الدین اولیا کے مزار سے آگے بڑھا تو ایک خستہ حال دروازہ

نظر آیا۔ اس پر لکھا تھا— ''مدفن غالب ؔ'' میرے جی میں آئی کہ ایک کوئلہ کا ٹکڑا اٹھاؤں اور اس کے نیچے لکھ دوں—

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے

مگر پھر میں نے سوچا کہ کس رند شاہد باز کے لئے یہ تکلیف مول لیتے ہو۔ میں آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے میں سوچنے لگا کہ یہ غالب کے یہاں موت کی اتنی شدید خواہش جو ملتی ہے وہ اس کی انفرادی خواہش ہے یا کسی اجتماعی خواہش کی ترجمان ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار سے لے کر قطب مینار تک ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ قدیم شکستہ عمارتوں کے سلسلے حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جا بجا شکستہ حال مقبرے اور کاہی آلود گنبد دکھائی دیتے ہیں۔ چپ چاپ اونگھتے ہوئے گدھوں نے ان مقبروں کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ویرانی دلّی کے کس گوشے میں نہیں ہے، ایک مہرولی پہ موقوف نہیں مجھے تو دلّی کی پوری فضا میں موت کے سائے کانپتے نظر آتے ہیں۔

۳۰/اگست

دلّی کی نہاری کا بہت شور سنا تھا۔ آج میں نے اسے بھی چکھ دیکھا۔ دو نوالے کھانے کے بعد کیفیت یہ ہوئی کہ زبان سُن ہو گئی اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ دلّی والوں کی زندگی میں سے تیزی اور گرمی غائب ہو چکی ہے۔ اس کی کمی وہ اب یوں پوری کر رہے ہیں۔ اس شہر میں آ کر میں بری طرح مایوس ہوا ہوں۔ بھلا یہاں والوں سے کیا توقع کی جائے وہ غریب تو دو ہی کام جانتے ہیں، نہاری کھاتے ہیں اور کبوتر اڑاتے ہیں۔ بھلا ہوا کہ مثنوی زہر عشق یہاں نہیں لکھی گئی ورنہ یہ لوگ تو کوٹھوں سے

کودکود کر جانیں دے دیتے۔ خیر وہ زندہ تو اب بھی نہیں ہیں۔

یکم ستمبر

اگست ختم ہوا... وہ مہینہ جس نے برعظیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا افتتاح کیا۔ آج ستمبر شروع ہوا ہے۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی ایک ایسا واقعہ دیکھا کہ سارا دن جی اداس رہا۔ میرے کمرے کے عین سامنے والے مکان میں کبوتر پلے ہوئے ہیں۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ آنکھ کھل گئی پھر بھی میں ذرا کروٹیں بدلتا رہا۔ سامنے والی چھت پر کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ ایک سفید کبوتر سب سے الگ منڈیر پر چپ چاپ اور افسردہ سا بیٹھا تھا۔ اتنے میں کوئی چیز تیر کی طرح اس پر جھپٹی اور اسے اٹھا کر لے گئی۔ یہ ہے تو بڑا معمولی سا واقعہ دلّی کے کبوتر بازوں کے نہ معلوم کتنے کبوتر روز بیریوں کی نذر ہو جاتے ہیں مگر مجھ پر اس واقعہ کا دن بھر اثر رہا۔ اس کبوتر کی اداس صورت رہ رہ کر یاد آتی رہی۔

۲/ستمبر

آج ایک دہلوی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ کہتے تھے کہ ستمبر کا مہینہ دلّی کے لئے منحوس ہے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی ستمبر ہی کے مہینہ میں دلّی پر آفت آئی تھی۔ گویا دلّی والے کبوتروں، لالوں اور پتنگوں کے ہی رسیا نہیں ہیں، تو ہم پرستیوں میں بھی مبتلا ہیں۔ میں نے انھیں بے ساختہ جواب دیا کہ ”دلی اب نہ وہ دلی ہے نہ یہاں کوئی بہادر شاہ ظفر بیٹھا ہے۔ اب یہاں کون سی چیز تباہ ہونے کے لئے باقی ہے۔“

دہلوی بزرگ گرم ہو کر بولے — ”اے جناب ہماری دلّی کو آپ نے کیا سمجھا ہے۔ اس میں اب بھی بہت کچھ ہے۔ مرا ہاتھی سوالا کھ کا۔“

ان لوگوں سے کوئی کیا بات کرے۔ ہر بات پر کوئی ضرب المثل کہہ ڈالتے

ہیں، کوئی محاورہ جڑ دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ دلّی میں اب اگر غدر پڑے تو کبوتروں کی کابکوں اور لالوں کے پنجروں کے علاوہ اور کیا چیز تباہ ہوگی۔

۳/ستمبر

آج شام کو جب میں چتلی قبر سے گزر رہا تھا، ایک فقیر کو دیکھا۔ میلے کچیلے پھٹے کپڑے، لمبا تڑنگا، بڑی بڑی آنکھیں، پاٹ دار آواز، پیمبرانہ انداز میں اعلان کرتا چلا جاتا تھا کہ ''چاند گرہن پڑے گا۔ دان دو۔''

معلوم نہیں یہ فقیر کون سے چاند گرہن کا ذکر کرتا تھا۔ چاند گرہن تو پڑ رہا ہے۔ امرتسر سے کلکتہ تک مجھے تو گہن ہی گہن نظر آتا ہے۔ پاکستان کا پتہ نہیں ہے، وہ اب میرے لئے دوسرا ملک ہے۔

۴/ستمبر

دلّی کی فضا روز بروز مکدر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کچھ فضا خود مکدر ہے، کچھ افواہوں نے اسے مکدر کیا ہے۔ رات کو ٹہلنے کا دھرم اب بالکل نہیں رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ چراغ میں بتی پڑی ادھر ہم نے بستر سنبھالا۔ لیکن نیند رات گئے تک نہیں آتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ دلّی کے کتوں نے دفعتاً رونا بند کر دیا ہے۔ فضا میں ایک سناٹا طاری رہتا ہے۔ لیکن یہ سناٹا تو کتے کے رونے کی آوازوں سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہوتا ہے۔

— ● — ● —

(5)

بو جی نے تو کسی کے بارے میں تخصیص نہیں برتی تھی۔ سبھی محلہ والیوں کو بلاوا بھجوایا تھا۔ مگر گلشن نے واقعی تخصیص برتی۔ بہت سے گھروں کے بارے میں تو اس نے سرسری ٹالا اور حمید ڈاکیہ کی بیوی بلو کی تو دہلیز کو بھی اس نے نہیں چھوا۔ ہاں نمبردارنی سے وہ خاص طور پر کہہ کر آئی کہ "نمبردارنی صاب آج مجلس ہے۔ تم نہ آئیں تو بو جی بہت برا مانیں گی۔ اور سویرے سے آئیو۔" فرّو کوٹھے والی کے سلسلہ میں بھی اس نے اہتمام برتا تھا مگر اس میں دقت ہی کیا اٹھانی پڑی ہوگی۔ سامنے ہی تو اس کا مکان تھا۔ پھر گلشن کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ بڑی نک چڑھی ہے۔ اگر خاص طور پر اس سے نہ کہا گیا تو وہ نہیں آئے گی بلکہ کئی ایک مرتبہ تو گلشن نے بو جی سے شکایت بھی کی تھی، "اے بو جی یہ فرو کوٹھے والی تو ٹھسّے میں مری جاوے ہے۔ مُئی کا خصم منہ نئیں لگاتا اس پہ یہ حال ہے، کہیں ہوتا تو کچھ تو یہ تو زمین پہ قدم نئیں رکھتی۔" خیر یہ تو گلشن کا تکلف تھا ورنہ فرد زمین پر قدم تو اب بھی نہیں رکھتی تھی۔ فرو کوٹھے والی دراصل افسری فاطمہ تھی۔

قاعدے کی رو سے افسری کو بگڑ کر افو بننا چاہیے تھا لیکن یا تو عرف کی کوئی قواعد ہوتی ہی نہیں یا پھر بو جی نے اس کی پابندی لازمی نہ سمجھی۔ انھوں نے افسری کو بے سوچے سمجھے فرد کہنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ اوپر کے مکان پر رہتی تھی اس لئے 'کوٹھے والی' کا ٹکڑا اس کے عرف کے ساتھ اسی طرح جوڑ دیا گیا جس طرح شاعروں کے تخلص کے ساتھ دہلوی، دریابادی، لدھیانوی قسم کی دُمیں لگائی جاتی ہیں۔ بہرحال اس نام پر اعتراض کچھ بھی کئے جائیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں بندش کی چستی اور ایک قسم کی حرکت اور گرمی ضرور ہے بلکہ 'فرد' کا لفظ تو اچھا خاصا جوش کا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ عرف اتنا عام نہیں ہوا کہ لوگ اصل نام ہی کو بھول جاتے۔ آخر بو جی اسی بیٹے کی تو ماں تھیں جس کی اسلامی عوامی انقلابی تحریک ہزار کوششوں کے باوجود قبولِ عام حاصل نہ کر سکی۔ لیکن دراصل عرف کی کامیابی اور ناکامی میں اصل نام کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ جو نام، نام والے کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے انھیں تو عرف اس بری طرح فنا کرتے ہیں کہ ان کا نام ونشان بھی پھر نہیں ملتا۔ بلّو کی مثال موجود ہے، اور تو اور محلّہ کی بڑی بوڑھیوں تک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بلّو کا اصل نام کیا ہے۔ نمبردارنی تو ایک ایک کی سات پشتوں تک سے واقف تھیں لیکن بلّو کا اصل نام تو وہ بھی کبھی نہیں بتا سکیں، لیکن ایسے نام بھی ہوتے ہیں جن کا نام والے سے اتنا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ وہ زیر زبر تک کی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے ناموں پر عرف بھلا کب غلبہ پا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفیا جس نے ہر محلّے والے کے نام کو بگاڑا تھا فیاض خاں کے نام میں کبھی ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہ کر سکا۔ بجھی شخصیت والوں کا ذکر نہیں ہے۔ ان کا نام روز نام بدلئے روز ایک نیا عرف رکھئے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے لوگ ہر نام، ہر عرف اور ہر لقب کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ فضل حق

وکیل کا نام اگر ابوالحسن یا محمد عمر یا رضا علی ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ لیکن نوابن تو نوابن ہی تھی حالانکہ دنیا کو معلوم تھا کہ اس کے مرحوم شوہر نہ تو خود نواب تھے نہ کسی نواب کے دربان تھے۔ خیر یہاں تک تو ہم ایک اصول قائم کر سکتے ہیں کہ عرف وہ مقبول ہوتا ہے جو شخصیت کی پورے طور پر نمائندگی کرتا ہے۔ مگر عرف ظہور میں کیسے آتے ہیں اس کے متعلق کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ افسری تو اپنے نام کی بنا پر فرو بنی تھی۔ مگر بلّو اور نوابن کس بنا پر بلّو اور نوابن بنیں، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پھر نمبردارنی تو نمبردار کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے نمبردارنی کہلائیں لیکن بو.جی ڈپٹن کیوں نہیں کہلائیں حالانکہ ڈپٹی صاحب کا بڑا نام تھا۔ اگر ان کی آل اولاد بہت سی ہوتی اور محلّہ میں کیڑے مکوڑوں کی طرح بہی بہی پھرتی تو مان لیا جاتا کہ چلئے اکثریت نے بو.جی کہنا شروع کر دیا۔ وہ بو.جی بن گئیں۔ مگر ان کا تو لے دے کے ایک بیٹا تھا۔ اس نے بو.جی کہنا شروع کر دیا اور بو.جی بو.جی بن گئیں۔ حالانکہ اسی بیٹے نے جب اسلامی عوامی انقلابی تحریک شروع کی تو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خیر ذکر تو افسری کا تھا۔ دراصل افسری کی شخصیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کا اظہار پورے طور پر نہ تو افسری فاطمہ کے نام کے ذریعہ ہوتا اور نہ فرو کو ٹھے والی کے عروف کی وساطت سے ہوتا تھا بلکہ دونوں کو ملائیے تب کچھ پتہ چلتا تھا کہ یہ کس قسم کی عورت ہوگی۔ غالباً یہاں یہ جتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نام اور عرف دونوں اس کی غمازی کر رہے ہیں کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ عورت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال کے لپیٹے میں ہوگی۔ البتہ سا میں جو ایک قسم کی تمکنت اور وقار تھا اس کا تہ اس کے عرف سے نہیں بلکہ نام سے چلتا تھا۔ فیاض خاں کا قیاس ایک حد تک درست ہی تھا۔ وہ واقعی ایسی زیادہ حسین و جمیل نہیں تھی لیکن وہ سج دھج کی

عورت ضرور تھی۔ بدن چھریرا تو نہیں تھا لیکن ایسا بھاری بھی نہیں تھا۔ چوڑی ہڈی، لمبا قد، کھلتا ہوا رنگ، سینہ بھرا بھرا۔ کمر بے شک پتلی نہیں تھی لیکن کمر سے لے کر گردن تک کے خطوط بڑے ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ آنکھیں شربتی تھیں۔ شربتی آنکھوں میں وہ سیاہ آنکھوں والی چمک دمک تو نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی ان میں ایک سنجیدہ قسم کا ٹھہراؤ ضرور ہوتا ہے اور افسری کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں اس کیفیت کی حامل تھیں۔ لیکن اس کی شخصیت میں سب سے پر اثر اور جاذب تو جہ اس کے چہرے کی وہ کیفیت تھی جو یہ کہتی نظر آتی تھی کہ یہ ارد گرد کی ساری چیزیں ہیچ ہیں۔ اس جسم کو دیکھو جو جسم بھی ہے اور جسموں کا مرکز ثقل بھی ہے۔ جسم بھی دراصل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض جسم تو سرے سے جسم ہی نہیں ہوتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو جنس نہیں ہوتیں، محض صنف ہوتی ہیں، اور بعض جسم، جسم بھی ہوتے ہیں اور جسم سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بس یہ جی چاہتا ہے کہ سجدے میں جھک جایئے یا آرتی اتارنے لگئے۔ ان سب سے الگ ایک جسم ایسا بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر آدمی مرعوب ہو جاتا ہے۔ افسری شاید کچھ اسی قسم کی عورت تھی۔ وہ جس مکان میں رہتی تھی وہ کچھ اس زاویے سے واقع تھا کہ کمرے کی کھڑکی سبطین کی بیٹھک کے عین سامنے کھلتی تھی۔ یوں سبطین کے پاس بیٹھنے والے سارے مرد اس کی نگاہوں کی زد میں رہتے تھے لیکن وہ تو کبھی کسی کو خاطر ہی نہیں لائی اور سبطین سے جب دو تین مرتبہ اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو خود سبطین ہی کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس نے نہ تو شرما کر منھ چھپایا اور نہ نگاہ بازی کی۔ فیاض خاں دلّی جاتے ہوئے اگر چہ وہاں صرف ایک رات ٹھہرا تھا لیکن افسری کی نگاہ سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ افسری ہر ایک کا جائزہ ضرور لے لیتی تھی، اثر لے یا نہ لے۔ یہ پتہ نہیں کہ اس نے فیاض خاں کا صرف

جائزہ لینے پر قناعت کی تھی یا کچھ اثر بھی لیا تھا۔ وہ تھی بھی تو اتنی گہری کہ آسانی سے چغلی نہیں کھاتی تھی۔ شوہر سے اس کے کیسے تعلقات تھے، یہ تو شاید محلّہ میں صحیح طور پر کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ البتہ یہ سب جانتے تھے کہ اس کا شوہر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور اس پر آشوب زمانے میں جب کہ داڑھی والوں پر اپنی داڑھیاں بار ہو رہی تھیں، اس نے داڑھی چھوڑ دی تھی۔ اور یہ کہ اس کے دن میں بارہ سے زیادہ گھنٹے باہر صرف ہوتے تھے۔ کاروبار میں مصروف رہتا ہے یا واہی تواہی پھرتا ہے، اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ میاں بیوی میں پٹتی نہیں ہے۔ البتہ اتنا تو ظاہر تھا کہ وہ شوہر کا احترام مطلق نہیں کرتی تھی۔ وہ تو شاید اس کے وجود ہی کو نہیں گردانتی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ سوائے اپنے کس کے وجود کو گردانتی تھی۔ گلشن کی رائے اس کے بارے میں سو فیصدی درست تھی۔ وہ صرف نک چڑھی ہی نہیں تھی اِکل کھری بھی تھی۔ اس کی شکایت محلّہ کی ہر بی بی کو تھی۔ مگر اس نے بھی اس کان سنا اور اس کان اڑایا۔ البتہ بو جی کا وہ تھوڑا بہت احترام ضرور کرتی تھی۔ اوّل تو بو جی غریب تھیں، اللہ میاں کی گائے۔ پھر یہ کہ جب پاس پڑوس ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ راہ و رسم ہو ہی جاتی ہے۔ شاید اور کہیں سے بلاوا آتا تو افسری اسے خاطر میں نہ لاتی، لیکن بو جی کے یہاں وہ عین وقت پر پہنچی۔

گلشن نے یہی کہا تھا کہ مغرب کے فوراً بعد مجلس شروع ہو جائے گی۔ افسری مغرب کے فوراً بعد تو نہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ضرور پہنچ گئی تھی۔ لیکن مجلس کے وہاں ابھی کوئی آثار نہ تھے۔ البتہ چند ایک بیبیاں بہت زور شور سے گفتگو میں مصروف تھیں۔ افسری نے انھیں بڑے لئے دیے پن کے ساتھ سلام کیا۔ نمبر دارنی کو اس کی یہ روش مطلق نہ بھائی۔ وہ ہر نوجوان عورت سے یہ توقع رکھتی تھیں کہ وہ انھیں دیکھ کر

بجھ بجھ جائے گی۔ بو جی کے مطالبات مختصر تھے۔ انھوں نے اس لئے دیے سے سلام کو بھی غنیمت سمجھا۔ پھر انھیں میزبانی کا فرض بھی تو ادا کرنا تھا۔ بولیں — ''اے فرو اچھی تو ہے۔ بی بی تو مانس گند ہو گئی۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ مگر کیا مجال کہ کبھی صورت دکھاوے۔''

''بو جی کیا بتاؤں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کے پاس آؤں مگر پھر فرصت ہی نہ ملی۔''

''اے جا رہنے بھی دے۔ فرصت کو تجھ سے کون سا کام پھٹ پڑا۔ ہاں نہ بچے بیٹی تو ہم سے ملنا ہی نہ چاہتی ورنہ ڈوبا ایسا کیا تھا کہ وقت ہی نہ ملتا۔''

نمبر دارنی شاید موقعہ کی تاک میں تھیں۔ فوراً شروع ہو گئیں — ''اے نگوڑا آج کل کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ اب وہ اگلے زمانے کی محبتیں کہاں ہیں۔ اے بو جی تم نے تو ہماری بوا کو دیکھا تھا۔ کیسی ملنسار طبیعت کی تھیں۔ کسی کی ایسی ویسی خبر سن لیتی تھیں تو تڑپ جاتی تھیں۔ فوراً دیکھنے کو جاتی تھیں۔ مگر آج کل کی لونڈیوں کی آنکھ میں مروّت نہ دل میں محبت۔ خون سفید ہو گیا کسی کا دم چلنے لگے تو یہ منہ میں پانی بھی نہ ڈالیں۔''

یہ تقریر کرتے ہوئے نمبر دارنی غالباً یہ بھول گئی تھیں کہ ان کے پاس ہی ان کی بیٹی فرحت بیٹھی ہے جو اپنی کالجیت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ماں کو اپنے کمرے میں باریاب نہ ہونے دے۔ مجلس سے تو اسے کیا دلچسپی تھی، مگر کبھی کبھی وہ یہ ثابت کرنے پر بھی تو مائل ہو جاتی تھی کہ ایک کالج کی روشن خیال لڑکی بھی دقیانوسی رسموں کو برداشت کر سکتی ہے۔

لیکن بلّو نے نمبر دارنی کو اچھا جواب دیا — ''اے چلو رہنے بھی دو۔ آج کل تو

بس دور ہی بھلے ہیں۔ نہ ملیں گے نہ جوتیوں میں دال بٹے گی۔ مٹے ایسے ملنے پہ خاک۔''

بوجی کو بلّو کا یہ قنوطی انداز پسند نہ آیا۔ کہنے لگیں۔۔۔ ''اری بلّو یہ تو تیری خواہ مخواہ کی بات ہے۔ بھئی برتن جب ملیں گے تو کھنکیں گے بھی۔ ایسا کون سا گھر ہے جس میں بات نہیں نکلتی۔ چوہوں سے کان تو کٹائے نہیں ہیں کہ بات ہی نہ کریں۔''

''مگر بوجی بات کا بھی تو طریقہ ہووے ہے۔ آج کل کے لوگ کٹے مرے ہیں۔''

''اے رہنے بھی دے کیا کٹے مرے ہیں۔''

بلّو اگر ذرا دیر کر دیتی تو بوجی نے مورچہ فتح کر ہی لیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً پینترا بدلا اور سیاست کے میدان میں جا پہنچی۔۔۔ ''اوئی بوجی تم تو آنکھوں دیکھتے مکھی نگلو ہو۔ دیکھتی ہو نا کیا آفت نافت اٹھ رئی اے۔ سارا ملک تراہ تراہ بول گیا۔''

اس آفت نافت کی توجیہہ نمبردارنی نے کی۔۔۔ ''اجی میں تو جانوں کسی نے اس ملک میں سیہہ کا کانٹا گاڑ دیا ہے۔''

بلّو تنک کر بولی۔۔۔ ''اجی گاڑنے کو کیا جنید خاں آئے تھے۔ یہی کلموا فرنگی ہے بس کی گانٹھ۔''

فرنگی کے لفظ پہ بوجی کو فوراً غدر یاد آ گیا۔۔۔ ''اے ہے ان کمبختی مارے گوروں نے تو غدر میں بھی بہتیری آفت بوئی تھی۔ موئے جنیں کب یاں سے دفان ہوں گے۔''

فرحت اس بحث میں شریک ہونا اپنے شایان شان نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن بوجی کی بے خبری کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ آخر بول ہی پڑی۔۔۔ ''بوجی آپ کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔ انگریزوں کی حکومت تو ختم بھی ہو چکی۔ ہندوستان اور پاکستان کو

آزادی مل گئی ہے۔"

آزادی کے لفظ پر نمبردارنی بہت بپھریں۔ "آزادی... آزادی... اس اُچّی حرامزادی آزادی کی تو ناک چوٹی کاٹ کے جوتیں مار مار کے باہر دھکے دے دیے جائیں۔ چھنال نے آتے ہی خون خچر کرا دیے۔"

خون خچر کا لفظ سن کر نوابن کے جسم میں تھری تھری پیدا ہو گئی۔ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ "ارے بھئی بڑی قیامت اٹھ رئی اے۔ پنجاب میں تو نو نیزے پانی چڑھ رہا ہے۔ اور سنیں ہیں کہ دلّی میں بھی...."

دلّی کے متعلق بلّو کو کافی معلومات تھیں۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "اے سنیں کیا۔ ڈاک خانے میں تو گھڑی گھڑی کی خبر آ رئی اے۔ وہ کہہ رئے تھے کہ دلّی مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہے۔"

یہ فقرے سن کر بوجی کا سارا جسم کانپ اٹھا۔ مگر نمبردارنی نے خاک اثر نہ لیا۔ چمک کر بولیں۔ "اجی پنجابی تو ہمیشہ کے لڑاکے تھے مگر موئے دلّی والوں کو لڑنے کی کیا ہڑک اٹھی ہے۔"

نوابن نے اس کا فوراً جواب دیا۔ "اجی نمبردارنی یہ مت کہو۔ دلّی والے بھی مرچ ہیں مرچ۔ ڈوبا گاندھی اتنے دن سے واں پڑا تھا۔ لوگوں کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال ڈال دیے مگر کوئی مانا ہی نہیں۔"

نمبردارنی بے ساختہ بولیں۔ "اے آندھی گاندھی۔ متالولا پنگا۔ چاند گرہن کی پیدائش۔ وہ کیا ملاپ کرائے گا۔ اس نے تو کاک سی چیز نمک پہ وہ فیل مچائے کہ ساری دنیا ہل گئی۔"

بلّو کے سینے میں ابھی اور راز بھی پوشیدہ تھے اور بحث کسی اور طرف نکلی جا رہی

تھی۔ نمبردارنی کی بات کاٹتے ہوئے بولی— ''میرے تو سن سن کے ہوش اڑے جا رئے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ حسن پور میں بھی جو ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔''

حسن پور کا ذکر آتے ہی ایک دم سے ساری بیبیوں کے چہروں کی کیفیت بدل گئی۔ بوجی کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آنے لگے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی تسکین کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا— ''بی بی جب غدر پڑا تھا تو سارا ملک تراہ تراہ بول گیا مگر حسن پور کو اللہ نے اپنی امان میں رکھا۔ ہندو مسلمان ایک ہو گئے۔ یہ جو ہمارے سامنے والا پیپل ہے نئیں، اس پہ ایک آدمی ڈھول لے کے بیٹھ گیا تھا۔ جب گوجر چڑھ کے آئے تو اس نے ڈھول بجادیا۔ سب کے سب لٹھیں بلّم لے کے نکل آئے۔ گوجر یہ دیکھ کے باہر سے باہر ہی چلے گئے۔''

فرحت کو یہاں پھر مجبوراً بولنا پڑا— ''بوجی یہ غدر نہیں ہے۔ یہ تو ہندو مسلمانوں کا فساد ہے۔''

بلّو بولی— ''اجی بوجی وہ تو یہ کہہ رئے تھے کہ دلّی کے بعد حسن پور ہی کا نمبر ہے۔''

یہ فقرہ سن کر تو واقعی بوجی کے ہوش اڑ گئے مگر اس موقعہ پر افسری نے بڑا کام کیا۔ اب تک وہ بڑے صبر سے باتیں سنتی رہی تھی لیکن اب اسے مجبور ہو کر بوجی کو یہ یاد دہانی کرانی ہی پڑی کہ مجلس اب شروع ہو جانی چاہیے۔ بوجی نے فوراً گلشن کو کھٹکھٹایا۔ گلشن نے جھٹ پٹ اپنے فرائض انجام دیے۔ پھر انھوں نے بلّو سے کہا کہ ''بی بی مجلس شروع کر دو۔'' اور بلّو شہادت نامہ کھول کر بیٹھ گئی۔

نمبردارنی روتی کم تھیں، شور زیادہ مچاتی تھیں۔ لیکن بوجی شور نہیں مچا سکتی تھیں۔ وہ صرف روتی تھیں اور بڑے خلوص اور یکسوئی سے روتی تھیں اور آج تو ان پر کچھ بہت ہی زیادہ رقت طاری تھی۔ اس میں واقعاتِ کربلا کے ساتھ ساتھ بلّو کی درد

بھری آواز کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ پھر جب اس نے امام حسین کے بچپن کے واقعہ سے واقعہ کربلا کی طرف گریز کیا تو اس کی آواز میں اور رقت پیدا ہو گئی۔ ''کیوں حضرات سنا آپ نے کہ جس کے رونے سے فرشتہ ہائے آسمان گریاں ہوئے حیف صد حیف کہ اسی فرزندِ رسول کے ساتھ امت بے دین نے کیا کیا ظلم کئے۔ صحرائے کربلا میں پانی بند کیا اور تین روز کا بھوکا پیاسا زمین پر مثل گوسفند قربانی کے ذبح کیا اور سر انور کو امام مظلوم کے نوکِ نیزۂ طویل پر بلند کیا اور بستی بستی اور شہر شہر تشہیر کیا۔

درِ یگانہ دریائے مجمع البحرین بخوں طپیدہ کرب و بلا امامِ حسین

صاحب روضۃ الشہدا نے لکھا ہے کہ امام ہمام جب بعد زوال زمین پر تشریف لائے تو شمر خنجر بکف سینۂ بے کینہ امام پر چڑھا اور اس بے ادبی کا مرتکب ہوا کہ زمین کربلا لرز گئی۔ حمید کہ اس وقت میدان کربلا میں موجود تھا، کہتا ہے کہ بعد شہادت زمین کو زلزلہ آیا اور آسمان سے خون برسا اور ایک سیاہ آندھی اٹھی اور آفتاب کو گہن لگا اور منادی نے ندا کی کہ قُتِلَ الْحُسَیْن بِکَرْبَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْن بِکَرْبَلَا ٥ راویوں نے یوں بھی لکھا ہے کہ اس رات چاند کو گہن لگا۔ سارا چاند گہنا گیا اور رات بھر ایک بی بی کے نوحے کی آواز آتی رہی جو کبھی مشرق سے بلند ہوتی تھی اور کبھی مغرب سے آتی تھی اور کبھی ساری فضا میں پھیل جاتی تھی۔'' نمبر داری رو تو بہت دیر سے رہی تھیں لیکن اب ان کے آنسو بھی نکلنے شروع ہو گئے تھے، بلکہ اس وقت تو افسری کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ مگر شاید وہ رقیق القلبی کے کسی بڑے مظاہرے پر آمادہ نہ تھی۔ البتہ بو جی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے کا ایک کونہ آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا تھا اور بلّو اسی درد و سوز کے ساتھ پڑھے جا رہی تھی۔ منقول ہے کہ اس رات مدینے میں درمیان زمین و آسمان رونے کی صدائیں سنی گئیں اور ایک فرشتہ ندا دیتا تھا

کہ بخدا مسمار ہوئے ارکان دین کے، اور تاریک ہوئے ستار ہائے علم نبوت کے، اور مٹ گئے نشان پرہیز گاری کے۔ اے اہل یثرب یہ شہر قابل بود و باش کے نہیں رہا۔ آگاہ ہو کہ شہر مدینہ کی رونق جاتی رہی۔ اس لئے کہ مزارِ نبی کا مجاور اور تمھارا سردار اور جنت کا شہزادہ اور ساقی کوثر کا نورِ عین تین دن کا بھوکا پیاسا کربلا کی ریتی پہ ذبح کیا گیا۔ مومنین ادھر تو یہ حال تھا اور اُدھر کربلا میں ایک بی بی یوں نوحہ کر رہی تھی۔

بتلا دے اے زمیں مرے بھائی کو کیا ہوا زہرا کی عمر بھر کی کمائی کو کیا ہوا

نمبر دارنی کا گلا اور آنکھیں دونوں کام کر رہی تھیں۔ بو.جی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ تو ابن بھی حسب مقدور رو رہی تھی۔ بلّو کی آواز تھم گئی تھی اور رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر گلشن سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے اپنی نقل و حرکت سے گویا اس کا اعلان کیا کہ بس کرو۔ مجلس بہت دیر ہوئی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مجلس کی فضا کچھ ایسی جمی تھی کہ سنجیدگی کا طلسم ٹوٹنے کو ہی نہ کہتا تھا۔ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ کیسی ہی رقت کی مجلس ہو، ادھر مجلس ختم ہوئی اُدھر باتوں کی گرما گرمی شروع ہوئی۔ دراصل مجلس کی ایک بڑی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی بدولت مل بیٹھنے اور چٹخارے دار باتیں کرنے کا موقع میسر آ جاتا ہے۔ اگر مجلسیں کہیں محض غم حسین تک محدود رہا کرتیں تو پھر امام حسین کی شہادت سے بھی کڑی آزمائش بن جاتیں اور محرم میں جینا اجیرن ہو جاتا۔ لیکن یہ مجلس عجب تھی۔ حزن اور خاموشی نے ایسا جادو پھیلایا تھا کہ کسی کو بولنے، بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نمبر دارنی جب اچھی طرح آنسو پونچھ چکیں اور تبرک ان کی گود میں آ پڑا تو انھوں نے ایک دو نیم گرم فقرے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیم گرم فقرے محض تمہید تھے مگر انھوں نے خاطر خواہ اثر نہیں کیا۔ نمبر دارنی کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور انھوں نے دوبارہ اس قسم کے اقدام کی ہمت نہیں کی۔ البتہ گلشن کی بات کا نوٹس

ضرور لیا گیا۔ لیکن اس سے سنجیدگی کی فضا ٹوٹی تو نہیں اور شدید ہو گئی۔ نمبردارنی کی سوجھ بوجھ پر اسے شاید زیادہ اعتبار تھا۔ اسی لئے اس نے مخصوص طور پر نمبردارنی کو مخاطب کیا۔ ''نمبردارنی صاب! سنیں ہیں کہ اس جمعرات کو چاند گرہن پڑے گا۔''

''چاند گرہن۔'' بو جی کے منھ سے صرف اسی قدر نکل سکا۔

سب بیبیاں خاموش تھیں۔

آخر نمبردارنی بولیں۔ ''اری کون کہتا تھا؟''

''اجی وے رفیا کیوے تھا۔ کیوے تھا کہ آدھا چاند ڈوب جاوے گا۔''

''اللہ رحم کرے۔'' نوابن ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''بڑا سخت گرہن ہے۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔

نمبردارنی بلّو کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بی بی ذرا احتیاط رکھیو۔''

بلّو چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بو جی نہ معلوم کن خیالات میں گم تھیں۔ ایکا ایکی بولیں گویا خود اپنے آپ سے کہہ رہی ہیں۔ ''اللہ ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ ہماری خالہ بی کہا کرے تھیں کہ غدر کے دنوں میں ایسا گہن پڑا تھا کہ سارا چاند ڈوب گیا تھا۔''

خاموشی اور شدید ہو گئی۔ نمبردارنی نے خواہ مخواہ چھالیاں کترنی شروع کر دی تھیں۔ سب خاموش تھیں۔ صرف سروطے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب کے چہروں پر ایک سنجیدگی، ایک ہراس کی کیفیت طاری تھی۔ افسری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی شربتی آنکھوں کی گمبھیرتا کسی فوری واقعہ کا اثر نہیں تھی۔ وہ تو ایک مستقل کیفیت تھی۔ شاید اس نے اس خبر کا اثر ایسی

زیادہ شدت سے قبول بھی نہیں کیا تھا۔ ایکا ایکی وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اس کے اٹھتے ہی دوسری بیبیاں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بو جی نے چلتے چلتے افسری کو مخاطب کیا۔
''بیٹی احتیاط رکھیو ذرا خدا ہر بلا سے بچائے رکھے۔ بلکہ میرے ہی گھر آ جائیو۔''
افسری نے بہت خاموشی سے یہ فقرہ سنا اور برقعہ پہن اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

— ● — ● —

سبطین کی مخالفت کے باوجود نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کی تحریک جاری رہی اور نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کی تحریک کے باوجود حسن پور میں خوف و ہراس پھیلتا رہا۔ حسن پور کی آبادی کا طور یہ تھا کہ پورے محلے یا تو نرے ہندوؤں کے تھے یا نرے مسلمانوں کے تھے۔ حسن پور کی ناک ڈپٹی صاحب تھے اور ڈپٹی صاحب کا مکان اوپر کوٹ میں تھا۔ ڈپٹی صاحب برسوں ہوئے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن اوپر کوٹ کی دھاک اب تک قائم تھی۔ آخر حسن پور والے کالے خاں کا لوہا بھی تو مانتے ہی تھے۔ پھر شیر و پلہ دار بھی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ مٹھوا خود علّن کی دکان پر آ گے بیٹھا تھا اور ڈپٹی صاحب مر گئے تھے تو کیا ہوا تھا، لالہ رگھو بر دیال بزاز اور دوسرے رئیس عید بقر عید پر تو سبطین کے پاس آ ہی جاتے تھے۔ وضعداریاں تو اب چند مہینوں سے ختم ہوئی تھیں۔ اس کے بعد چکر الٹا گھوما اور حق صاحب اور نمبر دار صاحب نے ضرورت بے ضرورت لالہ رگھو بر دیال بزاز کی دکان پر پہنچ کر اپنی غیر فرقہ پرستانہ ذہنیت کا ڈھول پیٹنا شروع کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ فضا اور مکدر ہوئی اور اوپر کوٹ ایک بند

قلعہ بن کر رہ گیا۔ یوں حق صاحب اور نمبر دار صاحب لالہ رگھو بر دیال کی زیارت سے محروم ہو گئے۔ سنتے ہیں کہ وقت بدلتے بدلتے بدلتا ہے۔ مگر حسن پور میں تو وقت آناً فاناً بدلا۔ ساری وضعداریاں یکا یک بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ میل ملاپ ختم۔ لین دین بند۔ شبہ اور نفرت نے زور باندھا۔ مگر بی پنجاب سے آنے والے شرنارتھی حسن پور کے لئے دو تحفے لائے تھے۔ نفرت کا جذبہ اور انتقام کا جوش۔ یہ دونوں چیزیں ساری فضا پر چھا گئیں، طبیعتوں میں رَچ گئیں۔ پہلے ان کا خاموش مظاہرہ ہوا۔ سا خاموش مظاہرے کی ابتدا بالکل غیر محسوس طور پر ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ ساری فضا میں ایک اینٹھن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وقت کی رفتار کبھی آہت ہوئی کبھی تیز۔ کبھی تو یوں معلوم ہوتا کہ حسن پور والے بکٹٹ گھوڑوں پر سوار ہیں اور یہ گھوڑے ایک اتھاہ کھائی میں اترے چلے جا رہے ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ وقت کا جلوس تھم گیا ہے، جم کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دنوں میں ایک سراسیمگی کی کیفیت ہوتی اور راتوں پر ایک سکتہ سا طاری رہتا۔ رات شروع تو ہو جاتی تھی مگر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ بس یوں لگتا کہ تاریکی فضا میں رچ بس گئی ہے۔ وقت چلتے چلتے رک گیا ہے اور اب حسن پور میں دن کبھی نہیں نکلے گا۔ دن نکلنے کی ساری توقعات ختم ہو جاتیں اور دن نکل آتا مگر ہر قسم کے دھوم دھڑ کے کے بغیر حسن پور کے باغوں کی چڑیاں آخر کہاں ہجرت کر گئی تھیں اور کس احساس کے ماتحت ہجرت کر گئی تھیں؟ کیا واقعی چڑیوں کا وجدان اتنا تیز ہوتا ہے کہ وہ فضا کو سونگھ کر آنے والے وقت کی بو باس معلوم کر لیتی ہیں؟ کچھ بھی ہو بہر حال صبح نہایت خاموشی سے نمودار ہوتی۔ کہیں بہت دور سے مرغ کی اذان تیرتی ہوئی آتی۔ پھر فضا کے سناٹے میں اذان کی کانپتی ہوئی آوازیں بلند ہوتیں اور خاموشی میں ڈوب جاتیں۔ دور کے کسی مندر سے گھنٹہ بجنے کی مسلسل

آوازیں آتیں اور پھر خاموش ہو جاتیں۔ اجالا ہوتا جاتا اور حسن پور کی خاموش گلیاں بدستور خاموش رہتیں۔ پھر دن نکل آتا اور بڑی آہستگی سے کسی کنڈی کے کھلنے کی آواز آتی۔ اس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا دروازہ کھلتا اور گلیوں میں قدموں کی دبی دبی چاپ سنائی دیتی۔ دن چڑھنے لگتا اور دن کے چڑھنے پر یہ راز کھلتا کہ دن نہیں نکلا ہے بلکہ رات ہی نے ایک نیا سوانگ رچایا ہے۔ رات کا سوانگ جاری رہتا اور گلیوں اور سڑکوں پر بازاروں اور منڈیوں میں خاک اڑتی رہتی۔ اِکا دُکا راہگیر نظر آتا اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ گاہک چپ چاپ دکانوں پر نمودار ہوتے، آہستہ سے سودا مانگتے اور سودا سنبھال خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ گپ بازی کا دستور اٹھ گیا۔ دکانوں کے پٹروں پر بیٹھنے اور فقرہ بازیاں کرنے کا رواج ختم ہو گیا۔ قہقہے، گالیاں، آوازے... سب کچھ ختم ہو گیا۔ بس ایک اضمحلال کی کیفیت باقی رہ گئی۔ ہر بازار میں کھڑے ہو کر یہ گمان گزرتا کہ شہر میں کسی جنازے کا جلوس گشت کر رہا ہے اور اب وہ ادھر سے گزرنے والا ہے۔ جنازے کا جلوس دن بھر گشت کرتا رہتا۔ پھر شام ہوتی۔ دونوں وقت رواروی میں ملتے اور جدا ہو جاتے۔ قدموں کی چاپ یکا یک تیز ہو جاتی۔ لوگ عجلت میں بازاروں سے لوٹتے اور گلیوں میں داخل ہونے لگتے۔ لوگ گلیوں میں داخل ہونے لگتے اور دروازوں کے دھاڑ دھاڑ بند ہونے کی آوازیں آتیں۔ مکانوں کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے اور رفتہ رفتہ رات کا سناٹا پھر پوری بستی کو آدبوچتا۔

دن گزرتے گئے اور یہ غیر معمولی کیفیت معمول بن کر رہ گئی۔ ہراس زندگی کا جز بن گیا۔ افسردگی فضا کی نس نس میں رچ گئی۔ مغربی پنجاب سے شرنارتھیوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ پھر دلی کے فساد کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ یہ خبریں زیادہ

ہولناک، زیادہ دہشت خیز ہوتی گئیں۔ فضا میں اینٹھن کی کیفیت اور زیادہ شدید ہو گئی اور بالآخر ایک روز مادّہ پھٹ پڑا۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ مسجد میں اذان ہو رہی تھ۔ اس وقت ایک سایہ ہلتا کانپتا اوراو پر کوٹ میں داخل ہوا۔ علّن لالٹین جلا چکا تھا۔ آج اس کی دکان پر غیر معمولی خاموشی ہوئی تھی۔ اکیلا کالے خاں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور تو اور رفیا بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اتنے مین علّن چونک کر بولا— ''ابے یار کالے خاں دیکھیو بے یہ کون سالا شرابیوں کی طریوں سے جھومتا ہوا آریا اے۔''

کالے خاں نہ معلوم کس خیال میں گم تھا اور کس طرف اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ بولا— ''آنے دے بے۔ ہوگا کوئی سالا پلّہ دار تاڑی پی کے آریا ہوگا۔''

اتنے میں سایہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ علّن اور کالے خاں دونوں لپک کر پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ افسری کا شوہر رشید گرا پڑا ہے۔ سر پھٹا ہوا، کپڑے خون میں شرابور۔ انھوں نے جلدی جلدی اٹھایا اور اسے گھر پہنچایا۔ رشید لب دم تھا۔ گھر پہنچتے ہی پٹ سے دم دے دیا۔ اوپر کوٹ میں خبر آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا لپکا ہوا افسری کے گھر پہنچا۔ سارے محلّہ میں تہلکہ پڑ گیا۔ جس مرد نے سنا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جس عورت نے سنا اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اوپر کوٹ پر ہی کیا پورے حسن پور پر وہ رات بہت سخت گزری۔ کالے خاں، رفیا اور علّن کا گلیوں میں پہرا لگا۔ انھوں نے رات میں کئی مرتبہ آگ بجھانے کے انجن کی آواز سنی۔ سبطین نے، جو بھری بندوق کاندھے پر رکھے رات بھر اپنے کوٹھے پر بیٹھا رہا تھا، بار بار مختلف محلوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔

— ● — ● —

(6)

دلی

۶/ ستمبر

فضا کی اینٹھن ختم ہوئی۔ مگر عجب انداز سے۔ کوئی موہوم فتنہ عجب انداز سے برپا ہونے کا بہانہ ٹٹول رہا تھا۔ فتنہ کو برپا ہونے کا بہانہ مل ہی جاتا ہے۔ یہ دور اعصاب کی آزمائش کا دور ہے۔ خاموشی بھی اعصاب کو آزماتی ہے۔ ہنگامہ بھی اعصاب کو آزماتا ہے۔ وقت کا دستور یہ ہے کہ پہلے خاموشی چھا جاتی ہے اور اس خاموشی میں اتنی شدت اور ایسا ڈراؤنا پن ہوتا ہے کہ اعصاب چیخنے لگتے ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر اچانک خاموشی ٹوٹتی ہے اور ایسی قیامت اٹھتی ہے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور ذہن کی رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

۷/ ستمبر

فساد شروع ہوا اور آگ کی طرح پھیل گیا۔ ہر محلّہ پر یورش ہے اور ہر بستی پر

حملہ کی تیاریاں ہیں۔ رات ایسا شور ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یہ خوفناک شور خود آدمی کو پاگل کر دینے کو بہت کافی تھا۔ فائر انجنوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی رات بھر آتی رہیں۔ ان آوازوں کو سن کر یوں احساس ہوتا تھا کہ ساری دلّی شعلوں میں جھونک دی گئی ہے۔

اس فساد کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ معمولی فساد ہے اور دو چار دن میں پولس اس پر قابو پا لے گی۔ مگر بار بار میرا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی معمولی فساد نہیں ہے۔ یہ کوئی بڑی قیامت ہے، ۱۸۵۷ء کی قیامت سے بڑی قیامت۔

۸ر ستمبر

سارے محلّہ میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ہر چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔ جو خبریں یہاں پہنچ رہی ہیں وہ واقعی بڑی خوفناک ہیں۔ ان کا اثر یہی ہونا چاہیے جو ہو رہا ہے۔ مگر میں حیران ہوں کہ اس زمانے میں جب یہاں نہ کوئی آتا ہے نہ یہاں سے کوئی جاتا ہے، یہ پل پل کی خبریں یہاں کیسے پہنچتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انھیں خبریں ہی کہوں یا افواہیں کہوں۔ ممکن ہے ان کی اصلیت کچھ نہ ہو۔ یہ محض خوفزدہ تخیل کی ایجادیں ہوں۔ مگر اس زمانے میں واقعہ اور افواہ میں امتیاز کرنا بھی کچھ بے معنی سی بات ہے۔ معمولات کی دنیا میں افواہیں بڑی مبالغہ آمیز ہوتی ہیں۔ لیکن جب معمولات کا نظام درہم برہم ہو جائے تو واقعات اتنے مبالغہ آمیز پیمانے پر رونما ہوتے ہیں کہ غریب افواہوں کی ان کے سامنے کوئی بساط ہی نہیں رہتی۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ حقیقتیں افواہیں بن گئی ہیں اور افواہیں حقیقتیں۔ ایک خوفناک واقعہ ہوتا ہے اور اس کی خبر دم کے دم میں یوں پھیلتی ہے گویا یہ کوئی افواہ تھی جسے پھیلنے

کے لئے کسی ٹھوس مادی ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دلی شہر بہت سی الگ الگ دنیاؤں میں بٹ گیا ہے۔ ہر محلہ ایک الگ دنیا ہے جس کا باقی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر شہر کے جس کونے میں بھی جو کوئی واردات گزرتی ہے اس کی خبر بجلی کی سرعت سے پھیلتی ہے۔ شاید یوں ہوتا ہے کہ واردات ہوتی ہے اور فضا کی لہریں اسے سارے شہر میں پھیلا دیتی ہیں۔

۹؍ ستمبر کی رات

دن کے متعلق آخر کیا لکھوں۔ دن ہے کہاں۔ دلی میں جب دن نکلے گا، دیکھا جائے گا۔ اب تو رات کا تسلط ہے۔ ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا مگر حملہ نہیں ہوا۔ قیامت سر پر آ آ کر ٹل جاتی ہے۔ یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے۔ قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا اور جلاد کہیں کہ ہم حقی پی کر آتے ہیں۔ پھر تجھے پھانسی لگائیں گے۔ یہ پورا محلہ پھانسی کے تختہ پر کھڑا ہے۔ پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے، گلے میں نہیں آتا۔ لوگ اسے غنیمت سمجھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ پھانسی تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ پھانسی لگنے کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۱۰؍ ستمبر

پورے محلہ میں ایک سراسیمگی اور بدحواسی کی کیفیت طاری ہے۔ ہر شخص ڈرا ہوا ہے۔ پریشان دماغ خوفناک سے خوفناک تصویر بناتے ہیں اور پھر اس سے مطمئن نہ ہو کر اسے مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ خوفناک تصویر بنانا چاہتے ہیں۔
ہر شخص اس فکر میں ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ مگر

یہاں سے نکل کون سکتا ہے۔ ہم ایک قلعہ میں محصور ہیں۔ ایسا قلعہ جس کی ہر دیوار بودی ہے۔

خوف و ہراس کی کیفیت ہر چہرے پر نظر آتی ہے۔ مگر شاید یہ خوف کی انتہا نہیں ہے۔ خوف کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ آدمی بے خوف ہو جاتا ہے۔ مجھے خوف ہر جگہ نظر آتا ہے۔ خوف کی انتہا کہیں نظر نہیں آتی۔

۱۱ر ستمبر

آج میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہاں اس کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک تھی جسے دیکھ کر میں ایک مبہم خوف سے کانپ اٹھا۔ اپنے سامنے والے پنواڑی کی دکان پر میں نے اس شخص کو دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گم سم بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ اس کی نگاہیں خلا میں کسی چیز کو گھور رہی تھیں۔ ان نگاہوں میں ایک ایسی خوفناک کیفیت تھی کہ انھیں دیکھ کر خواہ مخواہ وحشت ہوتی تھی۔ پھر وہ ایکا ایکی پنواڑی سے مخاطب ہوا۔ ''پہلوان یو حملہ کیوں نہیں ہوتا؟'' پنواڑی نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ اس نے اتنی آہستہ سے جواب دیا کہ میں سن نہ سکا۔ میں نے بس یہ دیکھا کہ اس شخص نے اس جواب سے کوئی اثر نہیں لیا اور پھر اسی طرح خلا میں گھورنے لگا۔ بیڑی ختم کر چکنے کے بعد یہ شخص چپ چاپ اٹھا اور سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ اس کی چال ڈھال میں کچھ ایسی بے جگری کی کیفیت تھی جسے میں محسوس تو بہت شدت سے کر رہا ہوں مگر میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

اس شخص کا پنواڑی نے نام بھی لیا تھا۔ شیر خاں، شیرا، شیرو... نہ جانے کیا نام لیا تھا۔ بہر حال شیر پر کچھ نام ہے۔ مجھے دھیان پڑتا ہے کہ یہ نام میں نے کہیں سنا ہے۔ یہ شکل بھی مجھے دیکھی بھالی سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے

اسے کہاں دیکھا تھا۔ میں اتنے شہروں میں گھوما پھرا ہوں اور اتنے لوگوں کو میں نے دیکھا بھالا ہے کہ اب کسی کی شکل میرے ذہن میں واضح نہیں رہی ہے۔ دھندلی شکلوں کا ایک جلوس ہے جو میرے تصور میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اس مختصر سی آوارہ زندگی میں میں نے بھی کس کس قماش اور کس کس رنگ کا آدمی دیکھا ہے۔

۱۲/ستمبر

تذبذب کے لمحات طویل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس تشنج کی کیفیت سے مجھے ہنگامہ زیادہ پسند ہے۔ ساری دلّی میں ہنگامہ برپا ہے۔ ہنگامہ برپا نہیں ہوتا تو یہاں برپا نہیں ہوتا۔ اب تو یہ کیفیت نا قابل برداشت ہو چلی ہے۔ میرے ذہن کی رگیں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ پس یوں جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاؤں اور کسی ایسی سڑک پر پہنچوں جہاں ہر طرف کون ہو، لاشیں ہوں اور چیخ پکار ہو۔ آخر میں پھانسی کے تختے پر کب تک کھڑا رہوں۔ کیوں نہ میں خود ہی پھندے کو کھینچ کر گلے میں پھنسا لوں۔

۱۳/ستمبر

آج کوئی نئی تاریخ نہیں ہے۔ وہی کل کی تاریخ ادھ موئی حالت میں رینگ رہی ہے، بل کھا رہی ہے اور اگر واقعی آج کوئی نئی تاریخ ہے تو میں اسے کل کی تاریخ سے تمیز نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آج دن ہی نہیں نکلا۔ لہٰذا نئی تاریخ کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ رات جو کیفیت تھی وہ اب بھی جاری ہے۔ اس کیفیت کو میں کیسے بیان کروں۔ بھلا اتنی شدید کیفیتیں الفاظ میں کیسے بیان ہو سکتی ہیں۔ زبان تو کام چلاؤ چیز ہے۔ ایسی شدید کیفیتیں ظاہر ہی کب ہوتی ہیں جو ان کے اظہار کی ضرورت پیش آئے۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامہ اور شور کا ایک سیلاب ہے جو فضا

میں بلند ہوتا چلا جا رہا ہے اور جو پوری دتی کو اپنی رو میں بہا کر لے جائے گا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ فضا میں ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ مگر یہ سناٹا اس شور سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

فضا کی کیفیت اب بھی وہی ہے جو رات تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ رات آگ کے شعلوں نے فضا کو روشن رکھا تھا اور اب سورج کی ملگجی روشنی دیواروں اور میدانوں پر پڑ رہی ہے۔

۱۴/ ستمبر

معلوم نہیں آج کی تاریخ کلنڈر میں کس طرح لکھی ہوئی ہے۔ مگر مجھے وہ چمگادڑ کی طرح الٹی لٹکی نظر آتی ہے۔ شاید آج وقت ہی الٹا لٹک گیا ہے۔ میں رات بھر جاگا اور دن بھر سویا۔ دن ابر آلود تھا۔ رات جلتے ہوئے مکانوں نے فضا میں ہر طرف روشنی کر رکھی تھی۔ جس شخص کو میں نے دیکھا وہ ہونق بنا ہوا تھا۔ پریشان اور سراسیمہ تھا۔ مگر محلّہ کے اکثر کتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے چلتے پھرتے ہیں، محلّہ سے باہر جاتے ہیں اور گھوم پھر کر واپس آتے ہیں اور بیچ سڑک پر آرام کرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کا نظام الٹا ہو گیا ہے۔

؟ ستمبر

مجھے یاد نہیں آتا کہ آج کیا ہے۔ یا تو آج کوئی تاریخ ہے ہی نہیں ہے، اور اگر ہے تو وہ اتنی زبردست تاریخ ہے کہ میں اسے بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اس وقت میں جہاں ہوں، لوگ اسے پرانا قلعہ بتاتے ہیں۔ میں یہاں کب آیا اور کیسے آیا اس کا مجھے مطلق پتہ نہیں ہے۔ میرا ذہن اس وقت کچھ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے۔ میرے حافظہ میں بس کچھ انمل بے جوڑ تصویریں منڈلا رہی ہیں۔

میں ان میں ربط پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ سب دھندلی اور غیر واضح تصویریں ہیں۔ روشن تصویر تو بس اس شخص کی ہے جس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اور جو مسلسل دو دن تک مشین گن چلاتا رہا۔ یہ وہی شخص ہے۔ شیر خاں، شیرا، شیرو۔ جو بھی اس کا نام ہو۔ وہ تو نام سے اور ایک شخصیت تھا۔ اس کا دماغ کیسے خراب ہو گیا یہ میں نہیں جانتا۔ ہاں میں یہ جانتا ہوں کہ اس کی جگہ جو بھی ہوتا اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ یہاں پرانے قلعہ میں ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتا ہے۔ یہ عجب کرشمہ ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی بصارت پر شبہ گزرنے لگتا ہے۔ کسی پاس سے گزرتے ہوئے آدمی کو میں چھو کر دیکھتا ہوں۔ وہ واقعی آدمی ہی ہوتا ہے اور پھر بھی اس کا دماغ چلا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن اس شخص کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سامنے والے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کے چہرے کے خطوط سخت پڑ گئے تھے۔ اس کے پورے جسم پر ایک خشونت طاری تھی۔ وہ بالکل گم سم ہو گیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے یا غلط کر رہا ہے۔ صحیح اور غلط کے متعلق شاید خود اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ باقی لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ محل کے چاروں طرف ایک شور برپا تھا۔ مسلسل شور اور مسلسل آگ۔ مکانوں میں آگ لگ رہی تھی۔ گولیاں دھوں دھاں چل رہی تھیں۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہے تھے اور وہ شخص اسی طرح گم سم وحشت زدہ کیفیت میں کھڑا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ آگ کے شعلوں، دھواں، گولیوں اور چیخ و پکار کی اس رستاخیز میں وہ شخص کہاں گیا۔ وہ گولی کا نشانہ بن گیا یا جل کر مر گیا، یا زمین میں سما گیا، یہ مجھے خبر

نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔

۱۸ر ستمبر

میرے حواس اب تک اعتدال پر نہیں آئے ہیں۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا ہے۔ میری آنکھوں سے گرمی نکل رہی ہے۔ نہ جانے کب سے نہیں سویا۔ جب بھی میری ذرا آنکھ لگتی ہے، شیر خاں کا گم سم وحشت زدہ چہرہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے لگتی ہیں اور دھوئیں شعلوں، چیخوں اور نعروں کا ایک مخلوط طوفان امنڈنے لگتا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ گم سم چہرہ میرے تصور میں بس گیا ہے، میرے ذہن پر مسلط ہو گیا ہے۔

۱۹ر ستمبر

شیر خاں کون تھا؟ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟ یہ سوالات آج دن بھر میرے ذہن میں چکر کاٹتے رہے ہیں۔ میں نے آج محلّہ کے کئی آدمیوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ وہ اتنا بتاتے ہیں کہ وہ شخص محلّہ میں نیا آیا تھا۔ اس کا نام شیر خاں نہیں شیرو تھا۔ سب کہتے ہیں کہ وہ مر گیا۔ کیسے مرا، یہ کسی کو پتہ نہیں۔ مجھے یہ نام بھی سنا ہوا سا معلوم دیتا ہے اور یہ چہرہ بھی دیکھا بھالا سا لگتا ہے۔ مگر میں نے اسے آخر کہاں دیکھا تھا۔ شاید میں نے اسے کہیں نہ دیکھا ہو۔ یہ محض میرا ایک خیال ہو۔ ممکن ہے شیرو خود کوئی شخص نہ ہو۔ محض ایک خیال ہو، ایک تصور ہو۔ وہ تصور جو اپنی قوم کی بربادی کے ہر موقع پر اپنی ایک جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ وہ تصور جو کبھی ٹیپو کے غفار کا بھیس بدلتا ہے اور کبھی بہادر شاہ ظفر کے کالے خاں گولنداز کے پیکر میں ظاہر ہوتا ہے۔

شیرو کے خوفناک تیور، اس کا گم سم چہرہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا

ہے۔ کبھی کبھی وہ پورا منظر اپنی شکل بدلنے لگتا ہے۔ وہ چھت لال قلعہ کی فصیل بن جاتی ہے اور شیرو مجھے کالے خاں گولنداز نظر آنے لگتا ہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ غفار ہے جو ایک ایسے قلعہ کی فصیل پر کھڑا ہے جس کے اندر کوئی ٹیپو نہیں ہے۔

کبھی کبھی تو میرے دل میں یہ خواہش کروٹ لینے لگتی ہے کہ اس المیہ کا کالے خاں گولنداز اس شخص کی بجائے میں ہوتا۔

۲۰/ستمبر

پرانے قلعہ میں پناہ گزینوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ محلے اجڑ رہے ہیں اور لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ مختلف محلوں سے لوگ سمٹ کر پرانے قلعہ میں آتے ہیں۔ پرانے قلعہ سے اسٹیشن پہنچتے ہیں۔ اسپیشل بھرتی ہے اور پاکستان روانہ ہو جاتی ہے۔ گاڑیوں پر حملوں کی خبریں روز پہنچتی ہیں اور پھر بھی لوگوں کا ذوق وشوق کم نہیں ہوتا۔ دلّی والے دلّی چھوڑ کر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے بیل رسّہ تڑا کر بھاگتا ہے۔

۲۱/ستمبر

دمشق میں قحط پڑ رہا ہے مگر یاروں نے عشق کو فراموش نہیں کیا ہے بلکہ شاید قحط کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہے۔ جو بھی نل پہ پانی لینے گیا وہ پیمبر ہو کر پلٹا۔ جو لڑکی کسی دوسرے خیمے کی طرف نکل گئی وہ ایک چوٹ مول لے کر واپس آئی۔ پرانے قلعہ میں دن بھر نکاح ہوتے ہیں۔ دولہا دلہن کو دہی راضی ہو جاتے ہیں۔ قاضی غریب تو مفت میں بدنام ہو رہا ہے۔ خانماں برباد پناہ گزینوں کے ہاتھ یہ اچھا مشغلہ آیا ہے۔ بیٹھے سے بیگار بھلی کا مضمون ہو رہا ہے۔

۲۲/ستمبر

بالآخر رخصت کی گھڑی آ پہنچی۔ اس عجیب وغریب شہر سے آج میں رخصت

ہو رہا ہوں۔ یہاں میں آیا بھی عجب انداز سے اور جا بھی رہا ہوں عجب انداز سے۔ میں نے مسلمانوں کے بہت سے شہر دیکھے، بہت سی بستیوں کی سیر کی، مگر اس بستی کا سفر سب سے انوکھا رہا۔ اس شہر کے در و دیوار، جن سے کل تک وحشت برستی تھی، آج چپ چاپ حسرت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ یہ لال قلعہ، یہ قطب مینار، یہ جامع مسجد، یہ مسلمانوں کی تاریخ کے گنگ نغمے، یہ پرسوز منجمد مرثیے، چند گھنٹوں کے اندر اندر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ یہ پوری بستی نگاہوں سے چھپ جائے گی، تاریکی میں ڈوب جائے گی اور میں اپنے نئے وطن کی طرف جا رہا ہوں گا۔

— ● — ● —

(7)

شہر سے جو سیاہ سایہ دار سڑک اسٹیشن کو جاتی ہے اسے دیکھ کر آج کچھ ایسا گمان گزرتا تھا کہ کوئی بڑا میلہ ڈھل رہا ہے۔ اس سڑک نے گنگا کے میلے اکثر ڈھلتے دیکھے تھے۔ لوگ منھ اندھیرے اٹھتے اور اکّوں تانگوں میں بیٹھ بیٹھ کر اسٹیشن کی راہ لیتے۔ جنھیں سواری نہ ملتی وہ پیدل ہی چل پڑتے اور ہنستے بولتے منزل پر پہنچ جاتے۔ اس سڑک سے ہٹ کر جو ایک کچی سڑک ریل کی پٹری کو پار کرتی ہوئی چلی گئی ہے۔ اس پر بیل گاڑیوں کا ایسا تانتا بندھتا تھا کہ ٹوٹنے میں نہ آتا۔ دیہاتیوں کی ایک ٹولی آواز میں آواز ملا کر گیت گانا شروع کر دیتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہتی اور پھر دوسری ٹولی گیت شروع کر دیتی۔ گیتوں کا یہ سلسلہ رات رات بھر اور دن دن بھر جاری رہتا۔ دن کے ہنگامے تو ان گیتوں کو کہاں ابھرنے دیتے تھے مگر مہاوٹوں کی راتوں میں وہ اپنی پوری کیفیت بن جاتے مگر یہ خاموش سہما ہوا میلہ اس ڈر سے کانپ رہا تھا کہ کہیں رات اس کے قدموں کی چاپ نہ سن لے۔ معلوم نہیں

رات کو کون سی گھڑی میں یہ میلہ ڈھلنا شروع ہوا تھا۔ لیکن جب اجالا ہوا تو سڑک پر دور تک اگوں، تانگوں، رکشاؤں کی ایک لین ڈوری نظر آئی۔ ایک بڑا ہجوم ایسا بھی تھا جس نے پیدل ہی اسٹیشن پہنچنے کی ٹھانی تھی۔ خاک آلود چہرے، پھٹی پھٹی آنکھیں، جھٹکے ہوئے بال، مضمحل جسم، جسم جو سُن ہو چکے تھے، جسم جو خود بخود حرکت کر رہے تھے۔ حسن پور کی فضا نے ایسا میلہ ڈھلتے ہوئے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔

اسٹیشن آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ چاروں طرف سامان کے اڑنگ کے اڑنگ لگے ہوئے تھے۔ بکنگ آفس کے سامنے ایک میلہ لگا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی پہ وہ دھکا پیل تھی کہ خدا کی پناہ۔ پہرے کے سپاہی کی جب ساری گالیاں بے اثر ثابت ہوئیں تو انسپکٹر پولس ہنٹر لے کر باہر نکلا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ مگر صرف تھوڑی دیر کے لئے چند منٹ بعد پھر آدمی پہ آدمی کرنے لگا۔ البتہ وہ سفید داڑھی والے بزرگ جن کے رخسار پہ ہنٹر پڑا تھا، پھر نظر نہیں آئے۔ ہجوم میں ہر قماش اور ہر حلیہ کا آدمی موجود تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو ڈھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے وجود کو بچا لانے کو ایک کارنامہ قرار دے رہے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جو گھروں میں جھاڑو دے کر آئے تھے اور ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ اپنے بھرے گھر چھوڑ آئے۔ بعض لوگوں کو اپنا وجود بھی بار گزر رہا تھا اور بعض لوگ یاں بچوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں سے بھری ہوئی کابکیں اور ٹاپوں میں بند مرغیاں بھی ہمراہ لائے تھے۔ بعض قلندر مزاج سارے گھر بار پہ لات مار کبوتروں کی کابک سر پر رکھ اسٹیشن آ پہنچے تھے۔ بلّو غریب پیٹ سے تھی۔ اپنا آپا سنبھالتی یا سامان باندھتی۔ اس کے ہاتھ میں بس ایک پوٹلی تھی۔ البتہ حمید ڈاکیہ نے ضروری چیزوں سے ٹرنک بھر لیا تھا۔ نوابن صرف ایک گٹھری بغل میں مار لائی تھی۔ ہاتھ میں طوطے کا پنجرا تھا۔ حق صاحب چار ٹرنک، ایک سوٹ کیس اور ایک بستر ہمراہ

لا سکے۔ انھیں اس موقعہ پر اہلیہ مرحومہ رہ رہ کر یاد آئیں۔ وہ ہوتیں تو وہ تھوڑا بہت سامان اور ساتھ لے آتے۔ نمبر دار نے بیٹی اور نقدی اور زیور تینوں چیزوں کو بذریعہ ہوائی جہاز لاہور بھیجنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس سے بیٹی کی عصمت کی حفاظت کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ دلّی کے فساد کی وجہ سے ہوائی جہاز پر پہنچنے کا رستہ ہی بند ہو گیا۔ اور اب نمبر دارنی کو گھر کے دوسرے سامان سے پہلے نقدی اور گہنے پاتے کے صندوق اور فرحت کی فکر کرنی پڑی۔ انھوں نے یہ عقلمندی کی تھی کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دوسرے سامان کے ساتھ ساتھ چارپائیوں کو کھول کر ان کے پائے پٹیاں بھی ایک جگہ باندھ لی تھیں مگر بکنگ آفس والا سخت متعصب نکلا۔ اس نے پائے پٹیوں کو بک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ افسری بو جی کے برابر کھڑی تھی۔ اس کی وہ تمکنت بدستور قائم تھی۔ ہاں اس کی شربتی آنکھیں اب کچھ اور زیادہ گمبھیر اور کچھ اور زیادہ افسردہ نظر آتی تھیں۔ بو جی کب تک کھڑی رہتیں، صندوق پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے گھر سے کبھی کاہے کو قدم نکالا تھا۔ زندگی مین ایک مرتبہ ضرور انھوں نے ایک عزیز کی موت میں شرکت کی غرض سے سفر کی نیت باندھی تھی۔ لیکن ابھی اسٹیشن نہ پہنچنے پائی تھیں کہ نیل کنٹھ رستہ کاٹ گیا۔ فوراً اکہ واپس کروایا اور اس کے بعد پھر کبھی سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ لیکن آج وہ ہر قسم کے شگون اور بدشگونی کو بھول کر بیٹے کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھیں اور بیٹا خود یہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ گھر سے کیوں نکل پڑا ہے۔ نمبر دار صاحب اور حق صاحب نے تو فساد ہوتے ہی ہجرت کی تجویز پیش کر دی تھی، مگر وہ ایسا اڑا کہ ان کی بات چلنے ہی نہ پائی۔ لیکن آج ان کی بات خود بخود چل گئی تھی اور وہ اسٹیشن پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی ایک عمر مسلمانوں کے زوال کے اسباب سمجھنے اور ان کی توجیہات کرنے میں صرف کی تھی، آج حسن پور

کے اسٹیشن پر مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ سبطین حیران تھا اور کالے خاں اور علن اور رفیا بھی حیران تھے۔ بو جی بھی حیران تھیں اور گار حسن پور کے درو دیوار مین ھیران ہونے کی صلاحیت ہوتی تو وہ بھی ضرور حیران ہوتے کہ حسن پور کے یہ ہیرو، اوپر کوٹ کے یہ مُدہ آخر کیوں جارہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ حسن پور کے درو دیوار حیران نہ ہوئے ہوں مگر علن کی دکان کی خستہ دیواریں ضرور حیران ہوئی ہوں گی۔ سب اپنا اپنا سامان لے کر نکلے تھے۔ کوئی تھوڑا سا سامان لے کر نکلا تھا، کوئی بہت سا سامان لے کر نکلا تھا۔ لیکن علن کون سا سامان لے کر نکلتا۔ اس کی دکان میں رکھا ہی کیا تھا۔ یہی سڑی بسی گڑ دھانیں اور ریوڑیاں اور ٹوٹی پھوٹی چلمیں۔ اس کی دولت دکان کی چیزیں نہیں، خود دکان تھی۔ دکان کو وہ کیونکر لاتا۔ اور اب وہ دکان باقی کہاں تھی۔ وہ تو شاہ بہرام کی سبز پری نکلی۔ شہر کے بادشاہ نے سبز پری کی سرائے کے گرد حلقہ ڈل دیا اور سبز پری لوٹ پوٹ کر کبوتری بنی اور اڑ گئی۔ سبز پری اڑ گئی، کھو گئی اور شاہ بہرام سر دھنتا رہ گیا۔ شاہ بہرام کی قسمت میں آوارگی لکھی تھی۔ شاہ بہرام آوارہ ہو گیا۔

ٹکٹ کی خریداری جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھی۔ اسباب بک کرانا خود ایک مسئلہ تھا۔ پھر گیٹ پر وہ بھیڑ تھی کہ اس کو دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ غرض پلیٹ فارم تک پہنچنا ہفت خواں کا معرکہ بن گیا۔ لیکن طے کرنے والوں نے ہفت خواں کی ساری منزلیں طے کیں اور جب اسپیشل اسٹیشن پر پہنچی تو اس میں آدمی ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ دراصل وہ تو دلّی کے اسٹیشن پہ ہی پر ہو چکی تھی۔ اب تو اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ لیکن جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، وہاں حسن پور کا ایک قافلہ کا قافلہ اور سما گیا۔ آدمی جب پھیلتا ہے تو وسیع و عریض زمین بھی تنگ ہونے

لگتی ہے اور جب سکڑتا ہے تو تل بن جاتا ہے۔ اس لدی پھندی گاڑی میں اور مسافر کیسے سمائے۔ بات تعجب خیز سہی مگر ہے واقعہ ہی۔ جو شخص جس ڈبے میں گھس سکا گھس گیا اور گھستے ہی ڈبے کا محافظ بن گیا۔ اس قسم کے خود ساختہ محافظ ہر ڈبے کے دروازے پہ ڈٹے کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پہ ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ یہ لوگ اسلامی احساس سے عاری ہیں۔ ان ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں میں سے جو شخص خوشامد درآمد سے یا دھینگا مشتی سے اندر پہنچ گیا، یک لخت ان کی صف میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف نفسا نفسی پڑی تھی۔ دوسروں کی کسے خبر ہوتی۔ لوگوں کو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص گاڑی میں داخل ہونے کے لئے باؤلا ہو رہا تھا۔ جو اندر داخل ہو گیا اسے جنت کا پروانہ مل گیا۔ جو رہ گیا اس کے لئے دنیا اندھیر ہو گئی۔ ایسے میں سبطین کی کیا چلتی اور بو جی غریب تو پس کے آٹا ہو جاتیں۔ مگر قسمت کی کارسازی دیکھئے کہ ایک ڈبے میں فیاض خاں بیٹھا نظر آ گیا۔ اس نے سبطین ہی کو نہیں، اوپر کوٹ کے اور بہت سے لوگوں کو بھی اپنے ڈبے میں گھسا لیا۔ بو جی گاڑی یمس بھلا کب سوار ہوئی تھیں اور اس پہ یہ دھکا پیل اور کشتم کشتا۔ پاؤں رکھتی کہیں تھیں، اور پڑتا کہیں تھا۔ اندر داخل ہوئیں تو ایک دلّی والی نے دھکا دیا، ''اوئی میرے پاؤں کا کچلا ہو گیا۔ اے بی آپ کو رتوند آتی ہے کیا؟''

بو جی نے فوراً معذرت کی، ''معاف کر دو۔ میں نے دیکھا نہیں تھا۔''

دلّی والی چپ تو ہو گئی مگر جب جگہ دینے کا سوال آیا تو پھر بھڑک اٹھی—

''اے واہ تم بڑی اائیں کہیں کی۔ میں خود پھنسی بیٹھی ہوں۔ دلّی سے بس یونہی چلی آ رہی ہوں۔ نگوڑا پاؤں بھی تو ایک جگہ رکھے رکھے سُن ہو گیا۔''

جیسے تیسے کر کے بو جی کو بیٹھنے کی جگہ ملی۔ اتنے میں نواب ن نے شور مچانا شروع

کر دیا— ''ائے ہئے میرے طوطے کا پنجرا رہ گیا۔ اے بھیا کوئی اٹھا دو۔'' اور جب کسی نے اس شور پہ دھیان نہ دیا تو س نے پینترا بدلا— ''اے توبہ توبہ کمبخت کیسے آدمی ہیں۔ ایسی بھی آپا دھاپی کیا۔ پنجرا اٹھانے سے نگوڑے ہاتھ تو نہ ٹوٹ جاویں گے۔''

آخر کالے خاں کی غیرت نے جوش مارا۔ کودتا پھاندتا وہ کھڑکی سے باہر پہنچا اور پنجرا لاکر نوابن کے حوالے کیا۔ بو جی کو اب تک تو تن بدن کا ہوش نہ تھا، لیکن بیٹھتے ہی انھوں نے ہوشمندی دکھائی اور اپنے اسباب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سبطین کو دیکھ کر ان کا سانس میں سانس آیا۔ گلشن تو خیر برابر ہی بستر پہ ڈٹی بیٹھی تھی۔ آس پاس کے مختلف چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ یکا یک چونکیں— ''اے سبطین، رفیا کہاں گیا۔''

سبطین نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ بھی ذرا گھبرایا— ''ارے بھئی، رفیا کدھر رہ گیا۔''

لیکن علّن نے فوراً اسے اطمینان دلا دیا— ''اجی وے ابھی گیا ہے بیڑی لینے۔ آتا ہوگا۔''

سبطین خاموش ہو گیا۔ رفیا بہت دیر تک واپس نہ آیا۔ گارڈ نے جب آخری سیٹی دی اس وقت وہ لپکا ہوا آیا۔ کھڑکی کا دروازہ بند تھا۔ کالے خاں نے بڑی مشکل سے اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایک دھیمے شور کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ مایوس اور افسردہ چہروں کی ایک پوری قطار سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس وقت گاڑی کے اندر والوں کو یہ احساس ہوا کہ کتنے لوگ ایسے تھے جنھیں گاڑی میں جگہ نہ مل سکی۔

رفیا کا منھ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ایک لمبا سا سانس لیتے ہوئے کہا— ''میاں میں تو وسے ہر ڈبہ میں دیکھیایا۔ وے کہیں بھی نہیں ہے۔''

کالے خاں کا افسردہ چہرہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا۔

علّن تھوڑی دیر تک بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا— ''وے کسی اور اسپیشل سے چل دیا۔''

سبطین کے کان کھڑے ہوئے— ''کون چل دیا؟''

رفیا نے جواب دیا— ''اجی کوئی بھی نہیں۔ وے تھا سپّو میاں۔ وے تھا نہیں شیرو۔'' اس کا لہجہ اور دھیما ہو گیا۔ ''وے دلّی چلا گیا تھا۔''

فیاض خاں گم متھان بنا بیٹھا تھا۔ خود سبطین کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی کہ اس سے بات کرے۔ 'شیرو' کے لفظ پہ وہ ایک ساتھ چونکا—

''کون؟ کالے خاں گولنداز؟...وہ...۔''

کالے خاں نے فوراً اسے ٹوکا— ''نہیں میاں، میں نہیں، وے تھا شیرو۔''

''شیرو؟...شیرو مر گیا۔''

...کالے خاں کے چہرے پہ مردنی چھا گئی۔ رفیا کا منہ اور لٹک گیا۔ سبطین حیرت سے کبھی کالے خاں، رفیا اور علّن کی صورتوں کو دیکھتا اور پھر فیاض خاں کے چہرے کے سخت ہوتے ہوئے خطوط کو تکنے لگتا۔ اتنے لوگوں کو سنجیدہ دیکھ کر دوسرے ڈبے والے خود بخود سنجیدہ ہو گئے۔ سارے ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ علّن ٹکٹکی باندھے فیاض خاں کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا— ''اچھا؟ شیرو مر گیا...؟''

''ہاں شیرو مر گیا...مارا گیا۔'' فیاض خاں کے لہجہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اس کا چہرہ اور سخت پڑ گیا تھا۔ اس پہ ایک مبہم تاریک سی پرچھائیں کانپ رہی تھی۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ بہت دور سے کسی خواب کی دنیا سے پہیوں کی

گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔ یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ اسٹیشن پیچھے رہ گیا تھا۔ سامنے حسن پور کی عمارتیں ایک ہجوم کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ اوپر کوٹ کی بہت سی عمارتیں ان میں صاف پہچانی جاسکتی تھیں۔ بعض عمارتیں جل پھنک گئی تھیں۔ بعض پہ صرف کالونس پتی ہوئی تھی۔ بعض کی سفیدی جوں کی توں قائم تھی۔ ڈپٹی صاحب کی بلند حویلی کے کنگروں نے استفہامیہ علامتوں کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ سبطین ٹکٹکی باندھے دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ گاڑی کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ حسن پور کے مکانات کے نقوش مدھم پڑتے جارہے تھے۔ سامنے ایک رائی کے کارخانے کا ستون نظر آتا۔ پھر شفاخانے کی عمارت دکھائی دی۔ پھر خالی میدان اِکا دکّا درخت سامنے آئے۔ حسن پور نے مدھم ہوتے ہوتے ایک میلی دھجی کی شکل اختیار کی۔ پھر وہ ایک بدرنگ نقطہ بن گیا۔ پھر یہ نقطہ آہستہ آہستہ فاصلہ کی دوری میں تحلیل ہوگیا۔ بوجی کی پلکوں پر دیر سے ایک قطرہ کانپ رہا تھا۔ انھوں نے دوپٹے کے آنچل سے آہستہ سے آنکھ کو پونچھا۔ پھر برقعہ کی نقاب گری اور بوجی نے سر اندر کرلیا۔

''مگر اس کا شوہر کہاں ہے؟'' فیاض خاں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

''فساد میں مارا گیا۔''

''بہت خوب۔''

سبطین جل کر بولا — ''اس کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی تمھیں۔''

''ایک شخص کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے کہ اس کی خوشی کی جائے۔ میں دلّی میں بہت بڑا جشن دیکھ کر آرہا ہوں۔'' فیاض خاں نے طنز کا جواب طنز سے دیا۔

سبطین گرما کر بولا — ''تو پھر چراغاں کیا ہوتا۔''

''اس کا انتظام تھا۔''

سبطین چپ ہو گیا۔ فیاض خاں کا چہرہ پھر سخت پڑتا چلا گیا اور ایک مبہم سی سیاہ پرچھائیں پھر اس کے چہرے پہ کانپنے لگی۔

بو جی اور دلّی والی کے باہمی اختلافات ختم ہو چکے تھے۔ سر سے سر جوڑ کر وہ کچھ اس طرح باتیں کر رہی تھیں گویا برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ دلّی والی کہہ رہی تھی— ''اے بوا جی، وہ مردار میلے سر سے حضرت کے روضے پہ پہنچ گئی۔ میں نے جو اسے دیکھا تو بندی تو تھرا گئی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اگلی جمعرات بھی نہ پکڑی لڑائی شروع ہو گئی۔''

برابر میں ایک اور دلّی والی بیٹھی تھی۔ گفتگو میں ٹانگ اڑاتے ہوئے بولی— ''اجی میں نے تو خالی کے مہینے ہی میں کہہ دیا تھا کہ کچھ ہو کے رہے گا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ دلّی میں دھوم کی برات نکل رہی ہے۔ باجا گاجا، انار، گولے، مہتابیاں چھٹتے چھٹتے پھلواری لٹنے لگی۔ میں جو صبح کو اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اے بی، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ایک دن چین کا نہ آیا اور وہ لٹس پڑی کہ دلّی کا اوجڑ ہو گیا۔''

بو جی کہنے لگیں— ''اری بی بی، میں نے تو جس دن دمدار ستارہ دیکھا تھا، اسی دن کہہ دیا تھا کہ غدر پڑے گا۔ نمبر دارنی تمھیں تو یاد ہے نا؟''

نمبر دارنی نے اثبات میں سر ہلایا— ''اے مجھے کیوں یاد نہ ہوتا۔ اس پہ میں نے یہ کہا تھا کہ بھئی آج کل تارے بہت ٹوٹ رہے ہیں۔''

غدر کا لفظ دلی والے کے لئے بہت خیال انگیز ثابت ہوا۔ بولی— ''میری اماں حضرت فرماتی تھیں کہ غدر میں جب گوروں کی توپیں دغیں تھیں تو ایک گولہ ہماری انگنائی میں آ کے گرا تھا۔ مگر یہ کلموئے تو گوروں سے بھی سوا ہاتھ بڑھ گئے۔ اے بی.

گوک پہ گولیاں یوں آ آ کے گریں جیسے چنے بھن رہے ہوں۔''

نمبردارنی نے بحث کو ایک دوسرے رخ پہ موڑنا چاہا— ''اری بی بی۔ بڑی تباہی آئی۔ روپیہ پیسہ، مال اسباب سب پانی کے ریلے میں بہہ گیا۔''

بو جی بات کاٹتے ہوئے بولیں— ''اے نگوڑے، پیسے کا کیا ہے، خاک سی چیز۔ وہ تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ مگر میں تو یہ کہوں ہوں کہ آبرو موتی کی سی آب ایک دفعہ جا کر پھر نہیں آتی۔ بس میرا تو انھیں ہولوں میں دم نکلتا تھا کہ کہیں آبرو....''

''اے بی آبرو وابرو کہاں رہی۔'' بو جی کی بات دلّی والی نے کاٹی۔'' آپ پرانے قلعہ میں ہوتیں تو دیکھ دیکھ کر غش کرنے لگتیں۔ آج کل کی لڑکیاں ہیں آفت کا پرکالہ ہیں۔ اس افراتفری میں تو اوائے اوسان خطا ہوتے تھے مگر ان کا تو اور دیدہ پھٹ گیا۔ مرداریں کھل کھیلیں۔'' اس کی آواز نے سرگوشی کی شکل اختیار کر لی۔'' اے بی! آپ کو کیا بتاؤں۔ اپنی ہی بات ہے۔ یہ گھٹنا کھولوں ہوں تو وہ گھٹنا کھلے ہے۔ وہ گھٹنا کھولوں ہوں تو یہ گھٹنا کھلے ہے۔ پرانے قلعہ میں روز یہی رہتا تھا۔ جس کی بات نکل گئی اس نے بیاہ رچا لیا۔ خاک ایسی شادی پہ، نہ مہندی نہ سندور، نہ ابٹنا۔''

نمبردارنی غصہ سے بولیں— ''نگوڑی شر میں بھی اٹھ گئیں۔ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ گائے گوبر کھائے گی اور بیٹی بر مانگے گی، تو وہ یہی زمانہ آ گیا ہے۔''

''ہاں بی بی۔'' بو جی ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولیں۔'' بڑا خراب زمانہ آیا ہے۔ یہ دنیا اب رہنے کی جگہ تھوڑائی ہے۔ کتوں چاٹی ہنڈیا ہے۔''

بو جی کے فقرے نے اپنا اثر دکھایا۔ فضا میں افسردگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بو جی پہ غنودگی طاری ہو گئی۔ دلّی والی نے بھی اونگھنا شروع کر دیا۔ گاڑی بدستور چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن آئے اور نکل نکل گئے۔ گاڑی جس اسٹیشن سے گزری، پلیٹ فارم کالی نظر آیا اور گیٹ کے جنگلوں پہ ایک ٹھٹھ دکھائی دیا۔ اسٹیشن سے ہٹ کر لوگ جا بجا قطار باندھے غور سے یہ تماشا دیکھتے نظر آئے۔ حسن پور والوں کی بارات نکل رہی تھی۔ جس نے اس بارات کو دیکھا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سہارن پور کے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی، اسٹیشن گزر گیا۔ رفتار بھی پھر تیز ہو گئی۔ اب شام ہو چلی تھی۔ جس تیزی سے گاڑی چل رہی تھی، تقریباً اسی تیزی سے دونوں وقت ملے اور جدا ہو گئے۔ یکا یک کوئی بولا، ''اب مشرقی پنجاب شروع ہونے والا ہے۔'' یہ فقرہ بہت آہستگی سے اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا گیا تھا۔ لیکن یہ عجب بات ہے کہ اکثر صورتوں میں ڈھول پیٹے جائیں اور گھروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو ہو کے خطاب کیا جائے۔ پھر بھی کوئی نہیں سنتا اور بعض فقرے ہونٹوں سے نکل نہیں پاتے اور لوگوں کے کانوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی والی مثل خواہ مخواہ تو پیدا ہوئی نہیں تھی۔ ایک شخص نے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ سب کے دل دھڑکنے لگے۔ ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ خاموشی نے سرگوشیوں کو جنم دیا۔ گفتگو کا تنوع ختم ہو گیا۔ سارے موضوعات پس منظر میں جا پڑے۔ اب ہر شخص کے لب پر مشرقی پنجاب کا ذکر تھا۔ پھر کسی نے آہستہ سے کہا، ''لو بھئی! یو پی کی سرحد ختم ہو گئی۔'' واقعہ یوں ہے کہ یہ فقرہ کہا نہیں گیا تھا، صرف محسوس کیا گیا تھا اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک سناٹا چھا گیا۔ گاڑی چلتی رہی، پہیوں کی گھڑ گھڑ کا شور ہوتا رہا اور سناٹا طاری رہا۔ پھر دلّی والی کا بچہ رو پڑا۔ اس نے کھٹ سے کرتا اٹھایا اور اپنی چھاتی

اس کے منہ میں دے دی مگر چھاتی چھوڑنے کی آواز بعد تک آتی رہی۔ نواب ن میں جرأت گفتار شاید اسی آواز نے پیدا کی تھی۔ اس نے نمبر دارنی کے کان میں کھسر پھسر کرنی شروع کر دی۔ ان کی کھسر پھسر سے بوجی کا حوصلہ بندھا اور وہ دلی والی کے کانوں میں باتیں کرنے لگی۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور حوصلہ سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک خربوزے کو دیکھ کر دوسرے خربوزے نے جو رنگ پکڑا تھا وہ باقی خربوزوں میں خود بخود منتقل ہوتا چلا گیا۔ سرگوشیاں پہلے تو اس قدر مدھم تھیں کہ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ خاموشی سانس لے رہی ہے۔ پھر خاموشی زور زور سے سانس لینے لگی۔ پھر سانس میں خراٹوں کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کانا پھوسی کرتے کرتے کسی کی ذرا زور سے آواز نکل گئی۔ دوسری ٹولی میں کسی بزرگ نے کو داعتادی کے مظاہرے کی غرض سے خود ہی کوئی فقرہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ یوں سرگوشیوں کو آواز مل گئی۔ لیکن اس بڑھتے ہوئے عمل میں یکا یک پھر پنچر لگ گئی۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ رفتار دھیمی ہوگئی، دھیمی ہوتی گئی اور آخر گاڑی رک کر کھڑی ہوگئی۔ ''حملہ ہوگا۔'' یہ فقرہ وجدان کی زبان سے ادا ہوا اور دلوں میں اترتا چلا گیا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ڈبے میں اندھیرا تھا۔ اس لئے یہ تو پتہ نہ چل سکا کہ لوگوں کے چہروں کی کیا کیفیت ہے، لیکن اتنا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے ہیں۔ دور دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ گاڑی کا ہر مسافر اپنی جگہ جما کا جما رہ گیا تھا۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس پوری گاڑی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ اندھیرے میں کسی کی صورت کیا دکھائی دیتی، بس بہت سے ساکت و جامد سایوں کا ایک ہجوم دکھائی پڑتا تھا۔ دفعتاً دیا سلائی گھسنے کی آواز اور آواز سے روشنی پیدا ہوئی۔

''یہ کون بے وقوف ہے؟'' حق صاحب نے دبی آواز سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یہ میں بے وقوف ہوں۔ فرمایئے کیا فرماتے ہیں آپ۔'' یہ آواز فیاض خاں کی تھی۔

حق صاحب کو سانپ سونگھ گیا۔

پچھلے کونے سے کوئی جلے تن بولا۔۔۔ ''اے صاحب! سگریٹ بجھایئے۔ روشنی کی سیدھ میں گولی آئے گی۔''

فیاض خاں نے ''اے صاحب'' کا ٹکڑا طنزاً دہراتے ہوئے کہا۔۔۔ ''اے صاحب، آپ کو میری بتیسی سے ایسی کیا دلچسپی ہے۔ میں پوپلا ہو جاؤں گا۔ ہو جانے دیجیے۔ آپ تو پاکستان اپنی بتیسی سمیت پہنچیں گے۔''

''پاکستان میں لوہے کے چنے چابنے پڑے تو خاں صاحب کیا کریں گے۔'' یہ دبی آواز غالباً رفیا کی تھی۔ اس کے برابر علّن بیٹھا تھا۔ اسی کے کان میں یہ بات کہی گئی ہوگی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ فیاض خاں بدستور سگریٹ پیتا رہا۔

''توبہ توبہ بڑی گھٹس ہے۔ نگوڑی گاڑی....''

یہ آواز شاید دلّی والی کی تھی جسے نمبردار صاحب نے بیچ میں کاٹ دیا۔۔۔ ''کون ہے یہ، خاموش رہو۔''

سکوت کی کیفیت پھر طاری ہو گئی۔ لمحے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے۔ پھر وقت تھم گیا۔ وقت اور ریل گاڑی کی دیکھا دیکھی ہوا بھی رُک گئی تھی۔ ڈبے کے اندر امس سے لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن کسی کو ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایکا ایکی کسی پیچھے کے ڈبے سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور کسی نے بساختہ کہا ''حملہ ہو گیا۔'' اس فقرے پہ ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فیاض خاں نے بلند آواز سے کہا۔۔۔

''کیاں صاحب، یہ کس بزرگ نے حملہ کرایا ہے؟'' خاموشی پھر عود کر آئی۔ فضا میں ایک سناٹے کی کیفیت طاری تھی۔ گاڑی جمی کھڑی تھی۔ ہر مسافر بت بنا بیٹھا تھا۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ آخر گاڑی کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ گاڑی چل پڑی۔ حملہ نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پرچھائیوں کو حرکت ہوئی۔ خاموشی ٹوٹ گئی۔

گاڑی کے ساتھ ساتھ ہوا بھی چلی۔ گرمی اور گھٹس کم ہوئی تو گرمی اور گھٹس کا احساس پیدا ہوا۔ اس کا اظہار سب سے پہلے نوابن نے کیا— ''اے توبہ! میرا تو گرمی کے مارے اچار پڑ گیا۔''

فیاض خاں نے بہت آہستہ سے سبطین سے پوچھا— ''وہ چٹنی کی ہنڈیا کدھر ہے؟''

''اس بھلاوے میں مت رہنا۔ چٹ کر جائے گی اور ڈکار نہیں لے گی۔''

''تم اسے چٹوری سمجھا کرو۔ اپنے لئے تو وہ چاٹ ہے۔''

سبطین حسب دستور پھر خاموش ہو گیا۔

گاڑی کی تیز رفتاری میں اب یکسانیت پیدا ہو چلی تھی۔ یوں باتیں بھی بڑی تیز رفتاری سے شروع ہوئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا بھی زور گھٹنے لگا۔ گلشن نے بستر پہ بیٹھے بیٹھے اطمینان سے کراٹے لینے شروع کر دیے تھے۔ بو جی کا سر دیوار پہ ٹک گیا تھا۔ لیکن انھیں آرام سے سونا نصیب نہ ہوا۔ دلّی والی عین کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی، سرکھاں ٹکاتی۔ جب اسے اونگھ آتی تھی تو اس کا سر ڈھلک کر بو جی کے شانے پہ ٹک جاتا تھا اور بو جی پھر چونک پڑتی تھیں۔ یہی حرکت نوابن نمبردارنی کے ساتھ کر رہی تھی۔ لیکن نمبردارنی اس قسم کے ہلکے پھلکے رخنوں کو کب خاطر میں لاتی تھیں۔ بلّو نے

پاؤں بھاری ہونے کی وجہ سے اتنی رعایت تو حاصل کر لی تھی کہ اسے صندوق کی بجائے نشست پر جگہ مل گئی تھی۔ مگر وہ اتنی جگہ کہاں تھی کہ وہ اپنے گھڑے سے پیٹ سمیت آنکھ لگا سکتی۔ ایک تو اندھیرا اور پھر بے ڈھنگی نقل و حرکت بیٹھنے والے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ گلشن دراصل بو جی کی ٹانگوں اور دلّی والی کی ٹانگوں کے بیچ میں جا ٹکی۔ نمبردارنی نے ذرا پیشاب خانے تک جانے کی خطا کی تھی، واپس جو آئیں تو نوابن نے کچھ اس طرح سے زاویہ بدل لیا تھا کہ انھیں صندوق پر جگہ تو مل گئی، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس سے کھسک کر بستر پر جا رہیں اور ان کا سر بلّو کی ٹانگوں کی بجائے فرحت کی ٹانگوں پہ جا ٹکا۔ جو غلطی نمبردارنی سے ہوئی تھی، وہ افسری سے بھی سرزد ہوئی۔ واپسی پر اس نے بو جی کے قریب بیٹھنے کی کوشش کی تھی مگر زاویہ بگڑا سو بگڑا۔ یہ اور بات ہے کہ افسری نے بگڑے ہوئے زاویے کو کچھ زیادہ بگڑا ہوا نہیں سمجھا۔

گاڑی رک رک کر چلی اور چل چل کر رکی۔ چلتے چلتے دفعتہً جنگل میں کھڑی ہو جاتی۔ لوگ چونک پڑتے۔ پہرے کے سپاہی اترتے، جنگل میں فلیش لائٹ پھینکتے۔ ایک دو ہوائی فائر کرتے اور گاڑی پھر چلنی شروع ہو جاتی۔ پھر باتیں ہونے لگتیں اور لوگ پھر اونگھنے لگتے۔ فیاض کاں اور سبطین بدستور جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھ پل بھر کے لئے نہیں لگی تھی۔ سبطین نے یہ عقلمندی کی تھی کہ رواروی میں کیپسٹن کے دو تین ڈبیاں جیب میں بھر لایا تھا۔ ان ڈبیوں نے بڑا کام دیا۔ ان کے بل پہ دونوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ وہ کیوں جاگ رہے تھے؟ ڈر کی وجہ سے؟ مگر علی الاعلان ڈرنے والے یا باتیں کر رہے تھے یا خراٹے بھی لے رہے تھے۔ ڈر کا مداوا اس کے سوا اور کیا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں نہ تو کر رہے تھے نہ خراٹے لے رہے تھے۔ سبطین کوئی بات کہتا، فیاض خاں اس کا جواب دیتا۔ مختصر جملوں میں مختصری

گفتگو ہوتی اور پھر دونوں خاموشی سے سگریٹ پینے لگتے۔ ان کی آوازیں خشک تھیں۔ ایسے موقعے بہت کم آئے جب ان کی آواز میں واقعی افسردگی کا رنگ پیدا ہوا۔ ان موقعوں پر اکثر یوں ہوا کہ جب فیاض کاں کے لہجہ میں افسردگی پیدا ہوئی تو سبطین نے طنز کیا اور جب سبطین کی آواز میں رقت پیدا ہوئی تو فیاض خاں نے قہقہہ لگایا۔ بسا اوقات آدمی کا چہرہ دل کا غماز بن جایا کرتا ہے، لیکن اسے کیا کہیئے کہ ڈبے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ان کے چہرے پہ جو کیفیت بھی ہو، وہ اس پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس رات اس اندھیرے نے بہتوں کے پردے رکھے اور بہتوں کے دلوں کے راز ظاہر کر دیے۔ اندھیرے میں بھلا کیا معلوم دیتا۔ نہ تو فیاض خاں اور سبطین کے چہرے نظر آتے تھے اور نہ افسری کا بے نقاب چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مختلف نازک موقعوں پر اس کے چہرے پہ کیا کیفیت گزری۔ اس کا علم بھی عالم الغیب ہی کو ہے کہ اس نے ارادتاً ایسا کیا تھا یا واقعی غنودگی کے عالم میں اس کا سر فیاض خاں کے شانے پہ جا ٹکا تھا۔ فیاض خاں نے پہلے تو کسی مخملی سی شے کو اپنے بدن سے لگتے ہوئے محسوس کیا اور پھر ایک معطر سر ڈھلک کر اس کے شانے پہ ٹک گیا۔ فیاض خاں نے بڑے سکون کا مظاہرہ کیا۔ چند منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دھیرے سے اس کا سر اٹھا کر الگ کیا اور چپکے سے اس کے کان میں کہا۔۔۔ ''گھر سے تکیہ لے کر نہیں چلی تھیں؟'' یہ بات بھی پردۂ تاریکی ہی میں رہی کہ افسری پر اس فقرے کا کیا اثر ہوا۔ البتہ جب فیاض خاں نے سگریٹ کا زور سے کش لیا تو اس کی روشنی میں اتنا نظر آیا کہ افسری کی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ غالباً چہرہ بھی سرخ پڑ گیا تھا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ محض سگریٹ کی سرخ لو کا کرشمہ ہوگا۔ گاڑی چلتے چلتے پھر رک گئی اور بیچ جنگل میں رکی۔ حق صاحب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔۔۔ ''کیا ہوا بھئی؟''

''حملہ ہونے والا ہے۔'' سبطین نے بڑے سکون سے حق صاحب کو اطلاع دی۔ اسے حق صاحب کو بنانے میں یوں بھی مزا آتا تھا۔

فیاض کاں نے برجستہ کہا ''مجھ پہ تو حملہ ہو چکا۔''

حق صاحب دونوں کو سمجھتے تھے۔ سمجھ گئے کہ خواہ مخواہ بنکارتے ہیں۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ پھر چل نکلی۔ حق صاحب نے اپنا وقت گنوانا مناسب نہ سمجھا۔ جس پھرتی سے جاگے تھے، اسی پھرتی سے پھر سو گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی گئی اور جاگ پڑنے والوں پر غنودگی کا جادو اسی رفتار سے پھر چڑھنے لگا۔ فیاض خاں نے ڈبیا سے نئی سگریٹ نکال کر جلائی اور ذرا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

— • — • —

گاڑی کی رفتار پھر دھیمی ہو چلی تھی۔ رات کی سیاہی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ایک دھند کی کیفیت ابھی باقی تھی۔ چاروں طرف فضا میں ایک بدرنگ دھند کی کیفیت طاری تھی۔ میدان اور کھیت دور تک اجاڑ پڑے تھے۔ جا بجا مویشیوں کے پورے پورے ڈھانچے اور خالی کھوپڑیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانی لاشیں بھی جا بجا نظر آئیں۔ میدان اور کھیتوں سے پرے ایک چھوٹی سی اجڑی ہوئی بستی اپنے مکینوں کا ماتم کر رہی تھی۔ بہت سے کچے مکانات تو بالکل ڈھیر ہو چکے تھے۔ کسی کسی کی ایک آدھ دیوار ضرور کھڑی رہ گئی تھی۔ پکا مکان ممکن ہے اس بستی میں ایک ہی ہو۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ دو دیواریں خالی کڑیوں کو دوش پہ سنبھالے کھڑی رہ گئی تھی۔ باقی سارا مال مسالہ نے ملبہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اجلا سا سفید مینار یہ بتانے کو باقی رہ گیا

تھا کہ یہ بستی مسجد سے محروم نہ تھی۔ گاڑی کی رفتار اور آہستہ ہو گئی۔ رفتار آہستہ ہونے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ کئی سفید کھمبے گاڑی کے برابر آئے اور نکل گئے۔ رفیا چونک کر بولا— ''ابے علّن، ابے او کالے خاں، ابے اٹھو بے نا امرتسر آ گیا۔''

کالے خاں اور علّن دونوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں— ''امرتسر آ گیا؟''

کئی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں— ''کیوں بھئی امرتسر ہے؟''

ایک طرف سے آواز آئی— ''امرتسر ابھی کہاں بھائی، یہ تو مجھے جالندھر لگے ہے۔''

اس پہ کسی نے ٹکڑا لگایا— ''میاں گھاس کھا گئے ہو۔ جالندھر امرتسر کے بعد آتا ہے۔''

''جالندھر تو رات گزر بھی لیا۔'' یہ انکشاف حق صاحب کی طرف سے کیا گیا جو رات بھر سوئے تھے۔

''بھئی انبالہ آ رہا ہے۔'' نمبردار صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔

لیکن جب پلیٹ فارم کے آغاز پر لدھیانہ کی تختی نظر پڑی تو ساری قیاس آرائیاں ختم ہو گئیں اور حسبِ دستور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ پلیٹ فارم پہ جا بجا شرنارتھی ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ بعض شرنارتھیوں نے اپنے خیموں کی حدیں اپنے بکس اور ٹرنک چن کر قائم کی تھیں۔ بعض شرنارتھیوں نے محض چارپائی کو کھڑا کر لینا ہی کافی سمجھا تھا۔ ایک سکھ شرنارتھی نے ایک بنچ پر بستر جما کر اپنا ٹھکانا کیا تھا۔ سامنے دوسرے پلیٹ فارم پہ شرنارتھیوں کی ایک گاڑی لدی پھندی کھڑی تھی جس کے ڈبوں سے زیادہ چھت پہ ہجوم تھا۔ چند ایک بگڑے دل انجن

پہ جا کے ٹک گئے تھے۔ ایک نوجوان سکھ شرنارتھی نے دو ڈبوں کے بیچ میں بڑے آرام سے زنجیروں میں اپنا گھونسلہ بنا لیا تھا۔ مہاجروں کے اس غول کو وہ اس بری طرح تک رہا تھا، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں کھا جائے گا۔ مگر ایک اس پہ ہی کیا منحصر تھا۔ وحشت تو ہر آنکھ سے برس رہی تھی۔ پلیٹ فارم پہ گھومنے والے سکھوں نے کچھ اور ٹھسّے کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیا تھا اور اپنی ننگی تلواروں کو کچھ اور زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی کے اندر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ نمبردارنی نے صرف چٹکی کے ذریعہ فرحت کو ہدایت کی تھی کہ کمبخت اس وقت تو منھ ڈھک لے۔ نوجوان عورتوں نے تقریباً سب نے ہی اپنے منھ ڈھک لئے تھے۔ البتہ افسری نے اس سلسلے میں کوئی اہتمام ضروری نہ سمجھا۔ اس نے نہ تو نقاب یکسر اٹھائی اور نہ اسے بالکل گرایا ہی۔ کمبخت نوابن کے طوطے کو بھی اسی وقت بولنا رہ گیا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے نغمہ سرائی شروع کی، ''میاں مٹھو نبی جی بھیجو۔'' خطا طوطے نے کی اور لوگوں نے گھورنا شروع کیا نوابن کو۔ نوابن غریب نے اسے بہت چمکارا اور دبی آواز میں کہا— ''میاں مٹھو اس وقت چپ ہو جاؤ۔'' مگر جب وہ چپ نہ ہوا اور نمبردارنی نے اشاروں اور نگاہوں سے بڑھ کر دبی ہوئی آواز میں تنبیہ کی تو نوابن نے غصہ میں آکر پنجرے کو جھنجھوڑ مارا۔ طوطے نے کلکاریاں لگائیں۔ پر پھڑ پھڑائے اور پھر ایک تیلی سے چمٹ کر وہ حیرت سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا مختصر سا جسم ایک کانپتی ہوئی سی شے بن کر رہ گیا تھا۔ دلّی والی کی صندلی بلّی نے بھی پر پرزے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے گود میں اسے ایسا بھینچا کہ وہ غریب پھر سر اٹھا ہی نہ سکی۔ خاموشی بہت دیر تک طاری رہی۔ لیکن خاموشی کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے کہ وہ بہت دیر تک طاری نہیں رہ سکتی۔ پہلے جسم حرکت میں آئے۔ پاس والوں سے پرے

سرکنے کی دبی آوازوں میں التجائیں کی گئیں۔ پھر کھسر پھسر ہونے لگی۔ ہاں جب کوئی شرنارتھی گاڑی کے برابر سے گھورتا ہوا نکلتا تو سناٹا چھا جاتا۔ اس کے گزر جانے پہ پھر کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ حق صاحب بے شک بہت ڈرے ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ سکھ اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کرنے کا حوصلہ سب سے پہلے انھوں نے ہی کیا تھا۔ جب وہ ڈبے کے برابر سے اندر جھانکتا ہوا گزر رہا تھا تو حق صاحب نے پہلے تو 'سردار جی' کے خطاب کے ساتھ بڑے محبت آمیز لہجہ میں سلام جھکایا۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے لیکن سردار جی انھیں گھورتے ہوئے چلے گئے اور حق صاحب نے اپنے ہونٹوں پہ جو مسکراہٹ پیدا کی تھی وہ ہونٹوں پہ اچھی طرح پھیلنے سے پہلے ہی مرگئی۔ فیاض خاں نے بہت گھور کر حق صاحب کو دیکھا۔ اس کے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔ اس نے بہت تیکھے انداز میں حق صاحب کو دیکھا اور بولا — ''کیوں جی حق صاحب کیا کہہ رہے تھے اس سے۔''

حق صاحب خفیف ہو کر بولے — ''کچھ نہیں بھئی، یہ پوچھتا تھا کہ گاڑی کب چلے گی؟''

''نیچے اتر کر پوچھ آیئے نا۔'' سبطین نے آہستہ سے کہا۔

حق صاحب اس فقرے کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔

خدا خدا کر کے گاڑی نے سرکنے کا نام لیا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اطمینان نے بھوک کا احساس دلایا۔ ہنڈیا دیگچیاں، ڈبے، ناشتہ دان کھٹا کھٹ کھلنے لگے۔ جن لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، ان میں سے ایک بڑی تعداد کو علّن نے بھنے چنے اور گڑ اور بودار ریوڑیاں سپلائی کیں۔ علّن نے یہ واقعی عقلمندی کی تھی کہ چلتے وقت اپنی دکان کے سارے چنے گڑ دھانیاں گولا چھوارے، ریوڑیاں اور الا بلا چادر

میں باندھ لایا تھا۔ علّن کی فیاضی سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ آخری کونے میں ایک صاحب نے اپنے لالوں کا پنجرا بلند کرتے ہوئے کہا۔

''اے صاحب! ہمارے لال بھوک سے دم توڑ رہے ہیں۔ دو دانے چنے کے دے دو۔''

کالے خاں نے چنوں کی لپ بھری اور خود اس شخص کی گود میں ڈال کر آیا۔ فیاض خاں نے سبطین کے ناشتے میں حصہ بٹانے سے صاف انکار کر دیا۔ بو جی نے بہت برا مانا۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ علّن سے چنے لے لینے میں اس نے کوئی غدر نہیں سمجھا۔ مگر اس نے چار پانچ پھنکیوں میں ان کا صفایا کر دیا۔ کالے خاں نے اسے ایک گڑ دھانی بھی دی تھی جسے وہ ایک وار میں چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے کالے خاں اور علّن دونوں کی ساری پیشکشوں کو رد کر دیا اور سبطین کے لوٹے کی ٹونٹی سے منہ لگا غٹ غٹ آدھا لوٹا پانی چڑھا گیا۔ دراصل بو جی افسری کو بھی تھوڑے سے ناشتہ سے نوازنا چاہتی تھیں۔ افسری اپنے چند ایک کپڑے اور کنگھی پٹی کا سامان تو ضرور ساتھ لے سکی تھی، لیکن کھانے پینے کے نام اس کے پاس دو چپاتیوں سے زیادہ کچھ نہ تھا اور وہ رات ہی ختم ہو گئی تھیں۔ لیکن حق صاحب نے بو جی کو زحمت کرنے سے روک دیا۔ انھوں نے دو چپاتیاں اور دو شامی کباب گلشن کی معرفت کھٹ سے اس کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اس سے پہلے وہ کئی چھوٹی موٹی مہربانیاں افسری پہ اور بھی کر چکے تھے۔ شاید اسی لئے اس نے ان کا خوان قبول کر لینے میں کچھ بہت زیادہ ہچر مچر نہیں کی۔ پانی کا گلاس بھی وہ اسے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن افسری نے عجلت برتی اور بو جی سے پانی لے لیا۔ اس پہ سبطین اور فیاض خاں دونوں نے کچھ اس انداز سے حق صاحب کو دیکھنا شروع کیا کہ وہ غریب بولا گئے۔

رفیا نے چپکے سے علّن کے کان میں کہا۔ "بے علّن! یہ وکیل تو فر و یہ لٹو ہو گیا۔"
علّن نے برجستہ جواب دیا۔ "وے بھی پھر کنی ہے۔ اسے تگنی کا ناچ نچاوے گی۔"

گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پہ پہنچ کر پھر رک گئی۔ اب ٹیکا ٹیک دو پہری کا وقت تھا اور لوگوں کے پاس پانی ختم ہو چلا تھا۔ سامنے نل چل رہا تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہ پڑی تھی کہ اتر کر پانی لے آئے۔ فیاض خاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نوابن کا کنستر لیا اور نیچے اتر گیا۔ اسے دیکھ کر کالے خاں اور سبطین بھی نل پر پہنچ گئے۔ جب انھوں نے مسلسل پانی لانا شروع کیا اور کوئی حادثہ رونما نہ ہوا تو دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور پھر تو بالٹیوں، گھڑوں، کنستروں، لوٹوں، ڈونگوں اور گلاسوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی۔ ڈبے میں جتنی بے والی وارث عورتیں تھیں، انھیں پانی فراہم کرنے کا فرض فیاض خاں اور کالے خاں نے انجام دیا۔ سبطین نے بھی یہ فرض انجام دینے کی نیت تو باندھی تھی لیکن غریب دھان پان سا آدمی، دو بالٹیوں کے بعد اس کا دم پھول گیا۔ خیر اس کی طرف سے رفیا یہ کام انجام دے رہا تھا۔ رفیا اور علّن نے بہت سے موٹے مسٹنڈے مردوں کو بھی پانی لانے کی زحمت سے بچایا جن میں حق صاحب اور نمبردار صاحب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فیاض خاں نے جن بے والی وارث عورتوں کو پانی لا کر دیا تھا ان میں افسری شامل نہیں تھی۔ اس نے اس کا لوٹا بھرنے کی پیشکش ضرور کی تھی مگر افسری نے اس پیش کش کو بڑی رعونت سے ٹھکرا دیا۔ فیاض خاں نے اسی رعونت سے اپنی پیش کش واپس لے لی۔ البتہ جب فیاض خاں کے چلے جانے پر حق صاحب نے اپنی بالٹی میں سے اس کے لوٹے میں پانی بھرا تو اس نے انھیں حقارت سے ضرور دیکھا مگر منع کرنے کا تکلف نہیں کیا۔

گاڑی پھر چل پڑی اور اپنی اسی پرانی چال سے چلی۔ جس بے ڈھنگے انداز میں رکتی تھی، اسی بے ڈھنگے انداز میں چلتی تھی۔ جب آس بالکل ٹوٹ جاتی تھی تو گاڑی اچانک چل پڑتی تھی۔ جب رکنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو یکا یک پہیے چرخ چوں کرتے اور گاڑی اڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ فضا ڈراؤنی، مناظر یکساں اور بے کیف اسٹیشنوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ برسوں سے ان میں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کھیت اور میدان اجاڑ سنسان۔ جا بجا مویشیوں کے ڈھانچے اور اکا دکا انسانی لاشیں، جلی پھنکی بستیاں، مسمار مسجدیں، بربادی کے مناظر میں بھی کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ فیاض خاں اور سبطین ٹکٹکی باندھے ان مناظر کو اس یکسوئی سے دیکھ رہے تھے کہ شاید انھیں یہ احساس بھی نہ رہا تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ بہت دور میدان میں ایک ادھ مرے سانپ کی طرح بل کھاتا ایک طول طویل قافلہ رینگتا چل رہا تھا۔ گاڑی چلتی رہی چلتی رہی اور ٹھیک بیاس کے پل پر پہنچ کر رک گئی۔ قافلہ ریل کی لائن کو کوٹتا ہوا گزر رہا تھا۔ چھکڑوں اور بیل گاڑیوں کا ایک سلسلہ بہت دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ خاک آلود چہرے، خوف سے لرزتے ہوئے جسم، وحشت آلود آنکھیں، ان کے سروں کے بڑے بڑے پگڑ اور چوڑے چکلتے تہبند اور قد آور جسم بتا رہے تھے کہ یہ لوگ بھی ضرور بہادر ہوں گے۔ انھوں نے نہ معلوم کیسے کیسے معرکے مارے ہوں گے اور کیسے کیسے سورماؤں سے ٹکریں لی ہوں گی۔ مگر وقت کی ایک جنبش نے انھیں بزدل بنا دیا تھا اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی زمینوں کو، اپنی آبائی بستیوں کو، یوں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ رہے تھے جیسے بھونچال میں لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ بھونچال واقعی آیا تھا۔ بھونچال خون برساتا اور انگارے اگلتا آیا تھا اور لوگ اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں کو، اپنی جمع جتھا اور اپنے ساز و سامان کو، اپنی

آبرو کو، اپنی آن کو غرض سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ جو لوگ گھوڑے کوداتے ان میدانوں میں داخل ہوئے تھے، آج چھکڑوں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ تاریخ میں تکرار ہی کا نہیں طنز کا پہلو بھی شامل ہے۔ گاڑیاں اور چھکڑے گزرتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پیدل قافلہ تھا۔ بوڑھے، نوجوان، بوڑھی عورتیں، حاملہ عورتیں، بچیاں، غرض ہر قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان عورتیں بھی تھیں، مگر نسبتاً کم۔ ڈھائی تین گھنٹے میں خدا خدا کر کے یہ قافلہ ختم ہوا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور چل نکلی۔

گاڑی چلتی رہی، رکتی رہی۔ رکتی رہی، چلتی رہی۔ دونوں وقت پھر تیزی سے ملے اور جدا ہو گئے۔ اجاڑ میدان اور جلی پھنکی بستیاں تاریکی میں روپوش ہو گئیں۔ رات گئے امرتسر اسٹیشن سے گاڑی تیزی سے گزری اور آگے بڑھ گئی۔ مگر جب آگے چل کر گھنے جنگل میں گاڑی رک گئی تو لوگوں کا کلیجہ پھر دھک سے رہ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پہیوں کو پھر جنبش ہوئی اور گاڑی چل نکلی۔ اٹاری کے اسٹیشن پر پہنچ کر پاکستان کی امانت پاکستان کے سپاہیوں کے سپرد ہوئی۔ وہاں سے گاڑی ذرا بڑھی تھی کہ ان تمام لوگوں نے، جو اب تک بہت دبکے دبکائے اور ڈرے سہمے بیٹھے تھے، پھریری لی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جذبات کی حرارت اظہار کے لئے نعروں کا سہارا ٹٹولنے لگی۔ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے ہر ڈبہ اور ڈبے سے باہر کی فضا گونج اٹھی۔ حق صاحب نے کچھ اس انداز سے پھریری لی جیسے مینہ پڑنے کے بعد مرغا اپنے گیلے پر جھاڑتا ہے۔ گردن پھلاتا ہے اور پھر ککڑوں کوں کی صدا بلند کرتا ہے۔ وہ اچانک کھڑے ہو گئے۔ جوش میں اور بہت سے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ چنانچہ پہلے تو حق صاحب کی کسی نے نہ سنی لیکن رفتہ رفتہ انھوں

نے مجمع پہ قابو پالیا۔ اب ان کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔۔۔ ''بھائیو مسلمانو! پاکستان ہم نے اپنا خون دے کر حاصل کیا ہے۔ اور جب ہم اس پاک سرزمین پہ قدم رکھنے والے ہیں، ہم اپنے خالق سے یہ عہد کریں کہ ہم پاکستان کی حفاظت کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں گے۔ مسلمانو! پاکستان تم سے ایمان کی طاقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایثار وقربانی کا جذبہ طلب کرتا ہے۔ تم پاکستان کا مطالبہ پورا کرو، غازیوں کی زندگی جیو اور شہیدوں کی موت مرو۔ یاد رکھو کہ ہمیں ایک مرتبہ اس طرف پھر پلٹنا ہے۔ ہم فوجیں لے کر پلٹیں گے اور لال قلعہ پہ پاکستانی جھنڈا لہرائیں گے۔''

اس آخری فقرے نے بڑا کام کیا۔ لوگوں نے بے تحاشا نعرے لگانے شروع کر دیے۔ فیاض خاں سبطین سے کہنے لگا۔۔۔ ''یار یہ تمھارا حق کیا کوئی بہروپیا ہے؟''

سبطین نے آہستہ سے جواب دیا۔۔۔ ''نہیں۔ مسلم لیگی ہے۔''

— • — • —

(8)

''تم کہاں کے رہنے والے ہو جی؟''

''امرتسر کا۔''

''امرتسر ختم کر کے آئے تھے یا پہلے ہی آ گئے تھے؟''

''جی کیا بتاؤں جی۔ جب امرتسر میں گولے چھٹنے لگے تب میں وہاں سے نکلا۔ سارا مال میرا غارت ہو گیا۔ جی کیا بتاؤں۔ امرتسر میں میرا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ یہاں میں کا یک میں بیٹھا ہوں اور پھر بھی الاٹمنٹ والے آ آ کے تنگ کرتے ہیں۔''

فیاض خاں اسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس نے اس کے چہرے پہ کسی گہرے دکھ کی علامت ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی اور آخر اپنی ناکامی پہ جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خاموشی سے چائے کے پیسے ادا کئے اور دکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے پھر لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیے۔ بلکہ شاید اب اس کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اسے تو جتنا غصہ آتا تھا، اتنا ہی اس کی چال میں تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ غصے

کی حالت میں وہ کب نہیں ہوتا تھا، یہ واقعی ایک سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں اور دوسری گلی سے تیسری گلی میں وہ یوں داخل ہو رہا تھا گویا بہت جلد اسے کہیں پہنچنا ہے۔ مگر اسے پہنچنا کہاں تھا؟ ایک بوڑھے کباب فروش کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ کباب فروش نے فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے برابر اپنی دکان جمائی تھی۔ کھمبے پر ایک پٹھے کا ٹکڑا لٹکا دیا گیا تھا جس پہ کالی روشنائی سے لکھا ہوا تھا— ''دلّی کا کباب والا۔'' فیاض خاں فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ''لاؤ بڑے میاں! کباب کھلاؤ۔''

کباب کھاتے کھاتے فیاض خاں نے پوچھا— ''کہو بڑے میاں فساد کے دنوں میں آئے تھے؟''

''ہاں میاں۔'' کباب فروش متاسفانہ لہجہ میں بولا۔ ''ساری دلّی میں آگ لگ رہی تھی۔ اپنی بھری دکان چھوڑ کے آیا ہوں۔ سامنے سیخیں رکھی تھیں۔ بس انھیں بغل میں مارا اور نکل پڑا۔'' کباب فروش آگ جھپکنے لگا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا— ''میاں بہت بڑی دکان تھی میری۔ یہاں کیا ہے سڑک پہ بیٹھا ہوں۔''

فیاض خاں اٹھ کھڑا ہوا— ''لو بڑے میاں اپنے پیسے۔'' اور آگے چل پڑا۔ پھر وہی لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ ہر ڈگ کے بعد اس کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ وہ کس سڑک پر سے گزر رہا تھا، اس کا شاید اسے احساس نہیں تھا۔ ایسے عالم میں اکثر وہ سڑکوں اور گلیوں کے احساس سے بری ہو جاتا تھا۔ دوکانیں اور دکانوں کے بڑے بڑے بورڈ سامنے آئے اور گزر گئے۔ تانگوں، سائیکلوں اور موٹروں کے شور میں وہ اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ایک رواں دواں، ہجوم تھا اور اس ہجوم میں وہ بہا چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ یہ ہجوم بڑھتا چلا جائے اور پھر بے تحاشہ وہ دوڑنا

شروع کردے پھر اتنا شور ہو کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور اس رستا خیز میں وہ گم ہو جائے، کھو جائے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ غیر واضح طور پر یہ خواہش بھی محسوس کی کہ ایکا ایکی زمین اس زور سے ہلے کہ یہ ساری بلند و بالا عمارتیں اڑا اڑا دھم کر کے نیچے آ گریں اور ساری چیزیں اوندھی ہو جائیں۔ اس نے اور برق رفتاری سے چلنا شروع کر دیا۔ کئی ایک شخصوں سے اس کی نادانستہ طور پر ٹکر ہوئی۔ ایک دو آدمیوں کو اس نے جان بوجھ کر کندھا مارا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اس کی اس روش کا ان پہ کیا ردعمل ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر وہ آگے بڑھے چلا گیا۔ پھر اچانک اس نے اپنے آپ کو ایک مختلف فضا میں پایا۔ یہاں نہ تانگوں اور موٹروں کا شور تھا نہ راہگیروں کا ہجوم تھا۔ اِکا دُکا راہگیر ایک فراغت کے احساس کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سائیکل سوار آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا نظر آتا اور اطمینان سے گزرا چلا جاتا۔ ایک دکان پر پٹھے کا ترشا ہوا ایک قد آدم بابو کھڑا مسکرارہا تھا جس کے پتلون اور کوٹ کا ایک ایک گوشہ پوری نفاست سے دکھایا گیا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا— ''اپنا سوٹ یہاں سلوایئے۔'' چند قدم کے فاصلہ پر ایک پنواڑی کی دکان نظر آئی جس پر چند آدمی بیٹھے باتیں گھوٹ رہے تھے۔ پنواڑی کی دکان دیکھ کر اس نے سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ اس نے بڑھ کر سگریٹ کا پیکٹ مانگا۔ دکان کے پتھر پہ ایک شخص بیٹھا کہہ رہا تھا: ''اماں مجھے تو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ سامان باندھ بوندھ گھر والوں کو لے کے نکل پڑا۔ بس میاں یہ سمجھ لو کہ اس نے بڑی خیریت کی۔ اور میں اسٹیشن پہنچا اور اُدھر وہاں حملہ ہو گیا۔'' فیاض خاں نے اسے گھور کے دیکھا اور پھر سگریٹ کے پیسے ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس خاموش اور پرسکون گلی میں اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی ایسی سڑک پہ

جا پہنچے جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہو اور تانگوں، موٹروں اور سائیکلوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ وہ پھر برق رفتاری سے چلنے لگا۔ گلی کے نکڑ پر ایک مزدور سے اس کی بری طرح ٹکر ہوئی۔ مزدور نے ترخ کر کہا۔ ''میاں سامنے دیکھ کر چلا کرو۔'' اس نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مختلف تنگ پتلی گلیوں اور پر ہجوم سڑکوں کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور طویل سڑک پر مڑتے ہوئے محسوس کیا۔ یہاں نہ سواریوں کا شور و غل تھا، نہ دوکانوں کی دو رویہ قطاریں تھیں۔ گھنے سایہ دار درخت دور تک دو رویہ صفیں باندھے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بس گزری چلی جاتی اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر خاموشی پھیل جاتی۔ یہ درخت کچھ یوں کہتے نظر آتے تھے کہ یہ لمحہ بھر کا شور کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے ہنگامے دیکھے ہیں۔ ہر ہنگامہ بالآخر ایک جاوداں سکوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فیاض خاں بدستور لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اب اسے اپنے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی اور اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی۔ راوی کے پل پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ پل پر کھڑے ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔ مگر یہ خیال جلد ہی زائل ہو گیا۔ اسے اس بات سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی کہ یہ دریا اتنی سست روی سے کیوں بہہ رہا ہے۔ اس میں ایک امنگ پیدا ہوئی کہ دریا کی لہریں بلند ہوتی چلی جائیں اور سمندروں کے شور کے ساتھ پل کے اوپر سے بہنے لگیں اور پھر پل منہدم ہو کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پھر خود بخود اس کے قدم اٹھ گئے اور وہ آگے بڑھ گیا۔ درختوں کے سائے اب کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ اس پر فضا سڑک پہ سے گزرتا ہوا وہ بالآخر مقبرہ جہانگیر میں جا پہنچا۔ آم کے ایک درخت کے نیچے ٹھنڈی گھاس

پہ وہ تھک کر لیٹ گیا۔ یہاں لیٹ کر اس نے پہلی مرتبہ واضح انداز میں سوچا کہ آخر لوگ افسوس کرنے کی باتوں پر افسوس کیوں نہیں کرتے۔ پھر وہ تنفر آمیز لہجہ میں بڑبڑایا۔ ''شہر تباہ ہو گئے اچھا ہوا۔'' اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ رات فیاض خاں نے مقبرہ جہانگیری ہی میں گزاری۔

ان دنوں فیاض خاں کی اکثر راتیں کھلی فضا میں بسر ہوئیں۔ مزمل نے سر سے سینہ پٹخا کہ میرے گھر رہو۔ مگر فیاض خاں جب ایک مرتبہ انکار کر دیتا تھا تو پھر وہ انکار اقرار میں نہیں بدلتا تھا۔ چنانچہ اس کی نہیں، نہیں ہی رہی۔ مزمل کے سارے دلائل اور ساری التجاؤں کا جواب بس اس نے ایک ہی دیا ''نہیں۔'' اس کے پاؤں میں چکر تھا یا کوئی ایسی چیز تھی جو اسے قرار لینے نہیں دیتی تھی، کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ ہر فضا اور ہر ماحول میں اسے خفقان ہوتا اور وہ بے تابانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا۔ کبھی وہ شہر کے ہنگامہ خیز اور پر ہجوم بازاروں میں گھومتا نظر آیا، کبھی شہر سے باہر کی خاموش سڑکوں پہ زمین کا گز بنا دکھائی دیا۔ اکثر وہ مہاجروں کے کیمپوں کے چکر کاٹتا بھی دیکھا گیا تھا۔ مہاجروں میں وہ ایک خاص قسم کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا اور جب یہ ردعمل اسے نظر نہ آیا تو اسے مہاجروں پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ پھر اس نے مقامی لوگوں میں ایک مخصوص قسم کے ردعمل کی جستجو کی۔ یہاں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ اس کے مزاج کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس کے لہجہ میں کچھ اور تلخی پیدا ہو گئی اور اس کی حرکات و سکنات میں ایسی تندی اور شدت پیدا ہو گئی جو عام طور پر انتہائی مایوسی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مزمل نے اس کے ساتھ نتھی ہونے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے ہر موقعہ پر اور ہر قدم پر اس کی حوصلہ شکنی کی۔ کبھی وہ مزمل سے کہتا ''جاؤ میاں اپنا کام کرو، میرے پیچھے کہاں لگے پھرتے ہو''، کبھی کہتا ''میاں میں کھو تو نہیں جاؤں گا اور کھو

جاؤں تو ڈھنڈورا پٹوا دینا۔'' مگر مزمل خاصا مستقل مزاج نکلا۔ وہ اس قسم کے سارے فقرے، ساری جھڑکیاں پی پی گیا۔ لیکن وہ کیسے کر سکتا تھا کہ چوبیسوں گھنٹے اسے آنکھوں سے اوجھل ہی نہ ہونے دے۔ مزمل کی نگاہ جب بھی چوکی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے جب بھی وہ اس سے جدا ہوا فیاض خاں ایسا غائب ہوا کہ تین تین چار چار دن تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ گھومتا گھامتا وہ خود ہی کسی روز اچانک سبطین کے گھر آن ٹپکتا۔ یوں رفتہ رفتہ سبطین کا گھر اس کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔ دراصل اسے مزمل سے زیادہ سبطین سمجھتا تھا۔ اس نے نہ تو اس کے اتھ لگنے کی کوشش کی اور نہ گھر پہ ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اخبار کی تجویز کا اس نے اس سے ضرور ذکر کیا، سو اس کی اس نے بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اخبار نہیں چلے گا۔

سبطین نے تاؤ میں آ کر کہا— ''چلنے نہ چلنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ ہم پرچون کی دکان نہیں کھول رہے ہیں۔ اس کا مقصد تو قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا ہے۔''

فیاض خاں تڑک کر بولا— ''قوم کا ضمیر ہے کہاں؟ بیدار کسے کرو گے؟''

فیاض خاں کی مخالفت پہ کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ سبطین اور مزمل دونوں قوم سے بہت پر امید تھے۔ سبطین کے گرداب پھر حوارین کا گروہ جمع ہوتا جا رہا تھا۔ مزمل کے ساتھ لاہور کے ایک اور جوشیلے طالب علم اجمل نے سبطین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ جب اخبار کی تجویز نے زیادہ زور پکڑا تو یہ دونوں منچلے سبطین کی بیٹھک ہی میں آ پڑے۔ مزمل کو دعا دیجئے کہ اس نے ایک اچھے خاصے بڑے مکان کا قبضہ سبطین کو دلا دیا تھا۔ سبطین نے اخبار کی جو اسکیم سب سے پہلے تیار کی، وہ بڑی جامع تھی۔ مگر اس میں روپے پیسے کا ذکر فکر کہیں نہیں تھا۔ یہ بات اسے حق صاحب کے یاد دلانے پر یاد آئی۔ یہ مشورہ بھی حق صاحب ہی کا تھا کہ چندے کے لئے

ایرا غیرا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر کے چند ایک رئیسوں سے مل لیجئے، وہ ضرور مدد کریں گے۔ آخر یہ فرض حق صاحب ہی نے ادا کیا کہ وہ سبطین کو مختلف رئیسوں سے ملانے کے لئے لے گئے، جن سے بقول ان کے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس قسم کی ملاقاتوں کے بعد ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ سبطین پان کی گلوری کلّے میں رکھے اکیلا گھر لوٹا۔ مزمل کی باز پرس کا ہمیشہ یہ جواب دیا گیا کہ — ''وہ آدمی تو تواضع کے ہیں۔ مگر حق صاحب نے مصلحتاً ہماری تحریک کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ پھر کسی دن جائیں گے۔'' آخر اس توجیہہ سے خود سبطین کو اکتاہٹ ہونے لگی اور اس نے ایک مرتبہ پھر مسلمان رئیسوں کے اخلاقی زوال کو اپنا محبوب موضوع قرار دیا۔ حق صاحب کا بھی اب اس مشغلہ سے دل بھر چکا تھا۔ شاید موضوع کی تبدیلی وہ بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک روز آ کر سبطین کو اطلاع دی کہ ایک پریس کے الاٹمنٹ کا مسئلہ درپیش ہے۔ انھوں نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ الاٹمنٹ افسر میرا ملاقاتی ہے۔ اس خبر سے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ سبطین نے ایک مرتبہ پھر پھریری لی اور اللہ کا نام لے کر پریس کے لئے درخواست داغ دی۔ اس کے بعد دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ دفتر کے ہر کلرک کی میز پہ دستک دی گئی اور ہر افسر سے ملاقات کی گئی۔ البتہ اس افسر کا پتہ نہ چلا جس سے حق صاحب کی علیک سلیک تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حق صاحب اس ساری مہم میں سبطین کے ہمرکاب رہے۔ اس مہم کا خاتمہ بالخیر یوں ہوا کہ وہ پریس ایک مہاجر دھوبی کو الاٹ ہوا۔ سبطین نے جب بہت ہائے توبہ مچائی تو اسے ایک لانڈری الاٹ کر دی گئی۔ سبطین یوں بھی مطمئن تھا کہ اس کی آمدنی سے اخبار چلایا جا سکتا ہے، مگر ایک رنگریز اس کے پیچھے پڑ گیا اور بڑے افسروں تک یہ بات پہنچادی کہ سبطین کو اس کام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور سبطین نے یہ کمال کیا کہ

وقت مقررہ پر لانڈری کا قبضہ لینے نہیں پہنچا۔ یوں آئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اس ناکامی کے بعد سبطین کے شاگردوں میں حق صاحب کے خلاف ایک عام ردعمل شروع ہو گیا۔ صرف ایک سبطین نے ان کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن نمبردار صاحب اس قسم کی بدنامیوں سے بچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے سبطین کے اخبار کے ذوق وشوق اور مسلسل ناکامیوں کو دیکھ کر ایک رجسٹرڈ کمپنی بنانے کی تجویز پیش کی تو کسی طرف سے ان پہ شبہ کا اظہار نہیں کیا گیا۔ نمبردار صاحب کو خود ان معاملات کا تجربہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے دو دن میں رجسٹرڈ کمپنی کا سارا خاکہ تیار کر ڈالا۔ اس کے بعد حصے بیچنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ نمبردار صاحب نے سبطین کو اطمینان دلایا کہ بہت سے صاحب استطاعت لوگ ان کے جاننے والے ہیں اور وہ ان کے کہنے سننے سے حصے خرید لیں گے اور یہ بات انھوں نے سچ ثابت کر دکھائی۔ کاغذ پہ متعدد نام لکھے گئے اور نمبردار صاحب جس کے پاس پہنچے اس نے حصہ خرید لیا۔ یوں کاغذ پہ پچاس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ جس سے ایک روزنامہ بآسانی جاری کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ ایک کباڑی نے دو سو روپے فوراً ادا بھی کر دیے۔ ان دو سو روپے کے زور پر دفتر کی سرگرمیاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ سبطین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ اردو اور انگریزی کے سارے روزانہ اخبار دے جایا کرو۔ چنانچہ روز دس بارہ اخبار آتے۔ سبطین بڑے انہماک سے سارے اخباروں کے اداریے پڑھتا۔ خاص خاص سطروں پر سرخ پنسل سے نشان لگاتا اور اہم سیاسی مضامین کے تراشے کاٹ کر رکھتا۔ اخباروں کے باقاعدہ فائل بننے شروع ہو گئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحریک کے پرانے ہمدردوں کو خط ڈالے گئے۔ تحریک کے ہمدرد اہل قلم کو قلم سنبھال لینے کی ہدایت کی گئی۔ اسٹیشنری بھی

خرید لی گئی۔ بس یہ انتظار تھا کہ باقی رقم وصول ہو تو بڑا سامان منگایا جائے اور باقاعدہ اخبار کے اجرا کا کام شروع کیا جائے۔ دن گزرتے گئے اور دو سو روپے کی گنتی کم ہوتی گئی۔ مزید رقم موصول نہیں ہوئی۔ نمبر دار صاحب اور سبطین صبح ہی صبح تقاضے کرنے نکلتے اور شام کو ناکام واپس آجاتے۔ اجمل اور مزمل یاد دہانی کے لئے جاتے اور منھ لٹکائے لوٹتے۔ رفتہ رفتہ دو سو روپے ختم ہو گئے۔ مزید رقم وصول نہیں ہوئی اور ایک دن سبطین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ "بھئی کل سے اخبارات مت لانا۔ بس ایک اخبار جو پہلے لایا کرتے تھے، ڈال جایا کرو۔"

آخر مزمل اور اجمل نے طے کیا کہ روزنامہ نکالنے کی توفیق تو ہمیں کبھی نہ ہوگی۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ بات ہفت روزہ پرچے سے شروع کی جائے۔ بعد کو اسے ہی روزنامہ بنالیں گے اور اس کے لئے جتنے سرمائے کی ضرورت ہے، وہ بآسانی جمع کیا جا سکتا ہے۔ غرض یوں مزمل اور اجمل نے کمر ہمت بناباندھی اور طلبا اور چھوٹے موٹے آدمیوں سے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ مزمل اور اجمل نے جس تندہی سے چندہ جمع کیا تھا اس تندہی سے اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کیا اور سارے انتظامات درست کئے۔ یہ دونوں شخص دن بھر پریس اور کاتبوں کے گھروں کے چکر لگاتے، ڈاک لاتے اور کاروباری خطوط کا جواب دیتے، ایجنٹوں سے بات چیت کرتے، خریداروں کے سوالات کے جواب دیتے، پرچہ پوسٹ کرتے اور بیٹھک کے نل پر اپنی خاکی قمیصیں دھوتے۔ سبطین سارے دن لکھتا۔ اڈیٹوریل، مضامین، اڈیٹر کی ڈاک کا کالم، خبروں کی تلخیص، خبروں پر تبصرہ، غرض یہ ہفت روزہ اخبار شروع سے آخر تک سبطین کے قلم کا مرہونِ منت ہوتا۔ مگر نہ محنت مشقت کام آئی، نہ خلوص سے بات بنی۔ ہر تدبیر الٹی پڑی۔ اخبار کو نہ چلنا تھا، نہ چلا۔

چندہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور ایک دن وہ آیا کہ پریس کی اجرت ادا کرنے کی غرض سے مزمل کو اپنے کورس کی ساری کتابیں یکمشت بیچ دینی پڑیں۔ دوسری مرتبہ اس عمل کو اجمل نے دہرایا۔ مگر اخبار کی حالت یوں کب سنبھلتی تھی۔ پرچے بک اسٹال پر بھیجے جاتے۔ وہاں وہ ہفتوں رکھے رہتے اور بالآخر خاک میں اٹ کر اپنے اصل مقام پہ واپس آ جاتے۔ کسی خریدار کے پاس پیسے بہت فالتو ہوئے تو اس نے پرچہ خرید لیا ورنہ عام طور پر یہی ہوا کہ دیکھنے والے نے پرچہ اٹھایا، الٹا پلٹا اور رکھ دیا۔ حق صاحب نے ایک روز ازراہِ ہمدردی یہ بتایا کہ پرچے کی پبلسٹی اچھی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سبطین نے ادھار قرض سے اشتہار چھپوائے اور اجمل اور مزمل نے خود جا جا کے اشتہاروں کو لوگوں میں تقسیم کیا اور دیواروں پہ چپکایا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ پھر جب اشتہارات کی کمی کی طرف اشارہ کیا گیا تو مزمل اپنے اثر ورسوخ سے دو ڈھائی اشتہار بھی جھپٹ لایا۔ مگر پرچے کی تقدیر میں تو ڈوبنا لکھا تھا، کسی طرح نہ ترا۔ پرچہ کسی طرح نہ ترا اور قوم کا ضمیر کسی صورت بیدار نہ ہوا۔

ایک روز جب فیاض خاں واہی تواہی گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کمرے کی بجلی غائب ہے۔ اس کی بجائے ایک موم بتی جل رہی ہے۔

''کیوں بھئی بجلی کو کیا ہوا؟''

''کٹ گئی۔'' مزمل نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''بل کے تین سو روپے کس گھر سے آتے؟'' سبطین بولا۔

''مگر تمھارا اخبار کا کام کیسے ہوا کرے گا؟''

سبطین حسرت آمیز لہجہ میں بولا— ''وہ کام اب ختم ہو گیا۔''

فیاض خاں نے چونکنا مطلق ضروری نہ سمجھا۔ اطمینان سے بولا — ''خیر وہ کام تو ختم ہونا ہی تھا۔ مجھے تمھاری فکر ہے۔ تمھارا وقت اب کیسے گزرا کرے گا۔''

اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ فیاض خاں نے جوتے کے تسمے کھولے اور چادر میں منہ لپیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

— • — • —

سبطین کا گھر اچھی خاصی سرائے بنا ہوا تھا۔ مردانے کے بڑے کمرے میں سبطین، فیاض خاں، مزمل اور جامل کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ حق صاحب بھی کافی دن تک یہاں جمے رہے۔ حمید ڈاکیہ کو بھی شروع میں یہیں پناہ لینی پڑی تھی۔ رفیا کی کوٹھری میں علن اور کالے خاں نے مستقل طور پر قیام کر رکھا تھا۔ علن کو کوئی دکان الاٹ نہ ہو سکی۔ لیکن لاہور میں مویشی بے تحاشا ذبح ہو رہے تھے۔ علّن نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور سیخ کے کباب بنانے شروع کر دیے۔ زنانے میں بو جی کے کمرے میں افسری نے بھی قیام کر رکھا تھا۔ ایک دوسرا چھوٹا سا کمرہ اور تھا جس میں بلّو اور نوابن نے بستر بچھا لئے۔ کوٹھری میں بو جی نے اپنا سامان بھر دیا تھا۔ اس لئے گلشن کو بھی اسی کمرے میں بسیرا کرنا پڑا۔ سای کمرے میں بلّو کے بچہ ہوا اور اسی کمرے میں نوابن کے طوطے نے انتقال کیا۔ نوابن کی یہ بڑی خواہش تھی کہ اس کے طوطے کی قبر کسی نیم کے درخت کے نیچے بنے۔ لیکن جب اڑوس پڑوس میں کہیں نیم نظر نہ آیا تو اس نے صحن کے ایک کونے میں اسے داب دیا۔ بو جی کا کمرہ مردانے کے بالکل برابر تھا۔ افسری کے رنگ ڈھنگ کا انھیں پتہ ہی نہیں چلا۔ گلشن کا ماتھا ضرور ٹھنکا

تھااوراس نے بو جی سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ مگر بو جی نے تو افسری کو بیٹی بنالیا تھا۔ وہ اب اس کے خلاف کسی شبہ کو دل میں کیسے جگہ دے سکتی تھیں۔ مردانے میں اور کسی کو تو نہیں مگر فیاض خاں کو ضرور حق صاحب کی حرکات وسکنات پر شبہ گزرا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے ان پر فقرہ بازی بھی کی۔ لیکن حق صاحب سارے فقرے شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے۔ حق صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ فیاض خاں خوش ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھر آتا ہے اسے جس طرح بھی ہو ٹالتے رہو۔ انھوں نے ہنگامے کا آغاز کرتے وقت بھی یہ دیکھ لیا تھا کہ فیاض خاں گھر میں نہیں ہے۔ سبطین کو ان کی روش بہت گراں گزری مگر وہ جو مثل ہے کہ جب دولہا دلہن راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ افسری میں کچھ ایسی گرمجوشی تو واقعی نہیں تھی مگر اسے انکار بھی نہیں ہوا اور بو جی نے افسری کو واقعی اس شان سے رخصت کیا جیسے لوگ بیٹی کو رخصت کرتے ہیں۔

تیسرے دن جب فیاض خاں گھر میں گھسا تو سبطین نے اسے اطلاع دی کہ حق صاحب کو ایک کارخانہ الاٹ ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے منتقل ہو گئے ہیں۔ فیاض خاں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''خس کم جہاں پاک۔'' مگر جب اسے یہ بتایا گیا کہ افسری بھی اس کے ساتھ گئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ فیاض خاں اپنے بوٹ کے تسمے کھول رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ اک ذرا سکتہ کے بعد اس نے تسمے پھر کس لئے اور بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔

فیاض خاں نے وہ رات سڑکوں پہ گھوم کر گزاری۔

— • — • —

(9)

افسری کے نکاح کے واقعہ پر بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ نکاح اچانک ہوا۔ کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ افسری حق صاحب سے بھی بیاہی جا سکتی ہے۔ اس میں ان بیبیوں کی واقعی بڑی کرکری ہوئی جو اڑتی چڑیا کو پکڑتی ہیں اور جن کے کان پتے کے کھڑ کنے پہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس واقعہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سب کو عین وقت پر پتہ چلا۔ شاید اس ناکامی کے احساس نے اس واقعہ کو اور اہمیت دے دی۔ بلّو کو اس واقعہ کے بعد ریل گاڑی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آئے۔ ان کی معنویت اس پہ اب روشن ہوئی اور اس نے ہر واقعہ کو بار بار ساری تفصیلات کے ساتھ سنایا۔ لیکن نمبردارنی اس واقعہ کی ابتدا ہجرت سے بہت پہلے سے بتاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ رشید کی زندگی میں ہی افسری اور حق صاحب میں آشنائی ہو چکی تھی۔ نوابن نے نمبردارنی کے اس خیال کی ہر موقعہ پر تائید کی اور اس کے ثبوت میں رشید اور افسری کی مسلسل ان بن کا ذکر بھی بار بار کیا۔ نمبردارنی نے یہ بات نمبردار کے حوالہ سے کہی کہ

حق صاحب ہر وقت سبطین کی بیٹھک میں پڑے رہتے تھے اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ افسری سے تاک جھانک کی جائے۔ انھوں نے رشید کی موت پر اس کے ردعمل کا بھی ذکر نکالا اور کہا—— ''اری خصم مرا تو وہ ایک دن بھی بیٹھ کے نہ روئی۔ اور کوئی ہوتی تو جیسے اس کا سہاگ لٹا تھا تو وہ تو سر بھی نہ اٹھاتی۔''

نوابن نے ساپہ ٹکڑا لگایا—— ''اجی اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اچھا ہوا چھٹکارا ملا۔ نابی بی اس مرد سے تو اس کا دل ہی نہ ملا۔''

بلّو بولی—— ''مگر وہ مرد بڑا جنتی تھا۔ اس نے اس کا ہاتھوں میں دل رکھا اور کوئی ہوتی تو ایسے میاں کے پیر دھو دھو کے پیتی۔''

نمبردارنی کہنے لگیں—— ''اجی وہ عورتیں اور ہوویں ہیں۔ یہ اچھال چھکا تو میاں کو خاطر ہی میں نہ لائی۔ اس کا تو دیدہ پھٹا ہوا تھا۔''

بلّو بحث کو سمیٹتے ہوئے بولی—— ''خیر بی بی وہ غریب تو اپنی جان سے گیا۔ اب یہ کچھ ہی کیا کرے۔''

افسری نے ان باتوں کا مطلق اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے نہ تو بیبیوں کی تہمت طرازیوں کا اثر قبول کیا اور نہ حق صاحب کے جوش و خروش کا اثر قبول کیا۔ حق صاحب نے بڑے چاؤ سے یہ بیاہ رچایا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد جن چیزوں نے انھیں قنوطیت سے نجات دلائی، ان میں ایک تو کارخانہ تھا، اور دوسری افسری تھی۔ یوں پاکستان آتے ہی وہ پھر مسلم لیگی بن گئے تھے۔ مگر انھیں اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ جن لوگوں نے پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اس کی خاطر اپنا تن من دھن لٹا دیا، انھیں اب دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا ہے۔ پاکستان کے سلسلہ میں انھوں نے خود جو جو قربانیاں دی تھیں، اس کا بھی انھیں احساس تھا۔ انھوں نے بار بار

لوگوں پہ یہ جتایا تھا کہ انتخابات کے سلسلہ میں وہ گاؤں گاؤں مارے پھرے اور حسن پور کے سارے ہندو ان کی جان کے دشمن ہو گئے، بلکہ ان کی وکالت بھی اس چکر میں ٹھپ ہوگئی، مگر پاکستان کی دھن میں انھوں نے اپنی جان کو جان نہ سمجھا اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دی۔ اس کے علاوہ انھیں اور بھی چھوٹی موٹی شکایتیں تھیں۔ ایک انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ پاکستان میں برسات ڈھنگ سے نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہوئی اور ایک سڑک پہ چلتے چلتے ان کا پاؤں پھسل گیا تو پھر انھیں پاکستان کی سڑکوں سے شکایت پیدا ہوگئی۔ جب انھیں کارخانہ الاٹ ہو گیا تو ان کی یہ ساری شکایتیں رفع ہو گئیں۔ اگر چہ یہ احساس انھیں پھر بھی رہا کہ انھوں نے پاکستان کے لئے جتنی قربانیاں دی تھیں ان کا انھیں قرار واقعی اجر نہیں ملا۔ تھوڑی بہت جو کسر باقی رہ گئی تھی، اسے افسری کے نکاح نے رفع کیا۔ اس کے چند دن تک سبطین کی بیٹھک میں ان کی صورت مطلق نظر نہ آئی۔ لیکن جب افسری اپنی بے نیازی پر بدستور ڈٹی رہی اور مختلف موقعوں پر حق صاحب کو بری طرح جھڑکیاں کھانی پڑیں تو انھوں نے رفتہ رفتہ پھر سبطین کے یہاں آنا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ پھر انھوں نے سبطین کی ہر تجویز پر بے سوچے سمجھے آمنا وصدقنا کہنے کا شعار اختیار کیا۔

رفتہ رفتہ افسری کی سرد مہری کے قصے عام ہونے شروع ہوئے۔ حق صاحب جو نکاح کے فوراً بعد کے زمانہ میں لفنگے تصور کئے گئے تھے، یکا یک سب کی ہمدردیوں کے مستحق بن گئے۔ بو جی کی ساری ہمدردیاں پہلے افسری کے ساتھ تھیں، مگر چونکہ اب اس نے ان کے یہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا، اس لئے وہ بھی اب اس سے کچھ فرنٹ ہو گئی تھیں۔ اس لئے ان واقعات پر تبصرہ کرنے کے لئے بلّو اور نواب ن کو نمبردارنی کے گھر جانے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑی۔ خود جب نمبردارنی وہاں

آئیں تو انھوں نے یہ قصہ چھیڑ دیا۔ نوابن نے نمبردارنی کے کان میں خاصی دیر تک باتیں کیں۔ آخر اس نے ذرا آواز بلند کی۔— ''اری میا! وہ خصم کو تو منھ ہی نہیں لگاتی۔ بات بات پہ جھڑکیاں دیوے ہے۔''

اب بلو کو بھی بولنے کا حق حاصل ہو گیا۔— ''اجی کیا پوچھو ہو۔ خصم غریب کی تو جان ضیق میں ہے۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا رہوے ہے۔ بیگم یہ کھاؤ۔ بیگم یہ لو۔ بیگم یہ کرو۔ اور بیگم کے ٹھستے میں گرم مصالحہ۔ اس سے بات نہیں کرتی۔ کسی بات پہ گار وہ بول پڑے ہے تو وہ کتے کی سی ٹانگ لیوے ہے کہ خدا کی پناہ۔''

نمبردارنی بولیں۔— ''بی بی سچ پوچھو تو اس عورت کا دیدہ پھٹ گیا ہے۔ گھر والی عورتوں کے تو اس کے طور ہی نہیں۔''

نوابن نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ زیادہ جسارت آمیز تھا۔— ''میا میری یہ بات لکھ لو۔ یہ اس مردے لگ کے نہیں بیٹھے گی۔''

اس فقرے نے بوجی کو بہت چونکایا۔ انھوں نے براہ راست فسری کی مذمت مناسب نہ سمجھی۔ صرف اتنا کہا۔— ''توبہ توبہ، برا زمانہ آیا ہے۔ ہمنے اپنے زمانے میں ایسی باتیں کاہے کو سنی تھیں۔''

بلو اس پہ چمک کر بولی۔— ''بوجی یہ چودھویں صدی ہے۔ اس زمانے میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔''

بوجی کو زمانہ پہ بہت غصہ آیا۔— ''اس زمانے کا تختہ لوٹے۔ اس میں کیا کیا ہوگا۔ گھر اوجڑ گئے، آدمی کٹ مر گئے۔ اس کمبخت کو صبر ہی نہیں آتا۔''

بوجی کے اس فقرے نے بحث کو دوسری طرف موڑ دیا اور اس لئے گلشن کو اب ان کے پاس بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ آج کل گلشن پہ افسری کچھ زیادہ ہی مہربان

تھی۔ اس لئے گلشن بھی اسے اطلاعات پہنچانے میں بخل نہیں برتتی تھی۔ البتہ فیاض خاں کے متعلق جب کبھی افسری نے اس سے کچھ پوچھا تو اس کے کان ضرور کھڑے ہوئے مگر وہ اس پوچھ گچھ کی لم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی۔

— ● — ● —

کئی ماہ تک علّن کا کوئی ٹھکانا نہ ہو سکا۔ اس کی دکان کیا چھٹی، وہ اچھا خاصا گھن چکّر بن گیا۔ اس کے مطالبات کچھ بہت لمبے چوڑے نہیں تھے۔ اسے ایک چھوٹی سی دکان کی تلاش تھی جہاں وہ تھوڑا بہت سودا خرید کر سجا لے اور اپنی کھوئی ہوئی دکان کی یاد تازہ کرے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

وہ خدا سے مانگتا تو شاید کچھ مل بھی جاتا۔ خدا ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی ضرور اپنے بندوں پہ رحم کھا لیتا ہے۔ مگر اس نے محکمہ بحالیات سے دوکان مانگی تھی۔ محکمہ بحالیات والوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ نہ ان کے قہر کا ٹھیک تھا نہ مہر کا۔ سخاوت اور بخل دونوں کا انھوں نے وہ اعجاز دکھایا کہ اگلے پچھلے سارے ریکارڈ مات ہو گئے۔ جس پہ مہربان ہوئے اس کا منھ موتیوں سے بھر دیا۔ جنہیں عنایت کا مستحق نہ سمجھا، انھوں نے الاٹمنٹ کے دفتروں کی دہلیز کی خاک نہ چھوڑی اور پھر بھی پیاسے ہی لوٹے۔ علّن پہ ایک مرتبہ عنایت ہوئی تھی، مگر عجب انداز سے۔ اس نے اپنے بارے میں درخواست میں لکھا تو یہی تھا کہ وہ حسن پور میں پنواڑی کی دوکان کرتا تھا۔ الاٹمنٹ والوں نے اس کے حال پہ کمال مہربانی کی کہ ایک انگریزی دواخانہ اس کے نام الاٹ کر دیا۔ اس پہ ایک مہاجر کمپاؤنڈر نے بہت شور مچایا۔ علّن بھی اس بے ڈھب عنایت سے کچھ خوش

نہ تھا۔ مہاجر کمپاؤنڈر کے شور مچانے پہ محکمہ کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ انگریزی دواخانہ علّن کے نام الاٹ نہیں ہونا چاہیے، مگر اس کے بعد وہ اس مہاجر کمپاؤنڈر کو نہیں بلکہ ایک پرچونئے کو الاٹ ہوا۔ بہر حال علّن اس جھک جھک سے بچ گیا۔ اس کے بعد اس نے بہت دوڑ دھوپ کی اور ایک ایک کلرک کی ہتھا جوڑی کی مگر پھر اس کی قسمت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ الاٹمنٹ والوں سے مایوس ہو کر علّن نے اپنے طور پہ دکان حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ دکان نہ ملنی تھی، نہ ملی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ بساط خانے کا سامان گاڑی پہ رکھ کے بیچا جائے۔ اس کے پاس رکھا کیا تھا جو یہ سامان خریدتا۔ قلاش اور بے سہارا مہاجروں کے لئے اس زمانے میں ایک ہی بیوپار کھلا ہوا تھا اور وہ تھا کبابوں کا بیوپار۔ لاہور میں مویشی دھڑا دھڑ ذبح ہو رہے تھے۔ جس کسی کو کوئی صورت نظر نہ آئی، اس نے بڑے کا تھوڑا سا گوشت خریدا، فٹ پاتھ پہ چولہا گرم کیا اور کباب بنانے شروع کر دیے۔ علّن جب ہر طرف سے مایوس ہوا تو وہ بھی آخر اسی طرف متوجہ ہوا۔ لنڈا بازار سے چھ سات سیخیں خریدیں، ایک دکاندار سے اس کے پتھر پہ بیٹھنے کا معاہدہ کیا اور مزے سے کباب بیچنے شروع کر دیے۔ یہی پتھر بالآخر علّن، رفیا اور کالے خاں کی ٹھیک بن گیا۔ مگر اس ٹھیک کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو حسن پور کی دکان کو حاصل تھی۔ اب وہ لوگ کہاں تھے جن کی علّن کی دکان پہ بیٹھک جما کرتی تھی اور جہاں بیٹھ کر رفیا کا تخیل بے لگام ہو جاتا تھا اور کالے خاں کی مونچھیں تن جاتی تھیں، اور علّن کا پلیوں خون بڑھتا تھا۔ سامنے سڑک پر بے سروسامان پریشان حال مہاجروں کی ٹولیاں نظر آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر قماش کا آدمی چلتا دکھائی دیتا۔ ہر رنگ کی صورت نظر آتی اور رفیا، علّن اور کالے خاں چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان کی وہ فقرہ بازیاں، وہ قہقہے، وہ گپ بازیاں

یوں ختم ہوئی تھیں گویا وہ ان سے کبھی آشنا ہی نہ تھے۔ دراصل تینوں ہی اب کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کالے خاں نے پشاور رجمنٹ کے واقعات سنانے چھوڑ دیے تھے۔ اب اسے بہت دنوں سے یہ بتانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ وہ واقعی پٹھان ہے۔ خیر کالے خاں یوں بھی ایسا باتونی نہیں تھا۔ تعجب تو رفیا پہ ہے جس کی زبان کبھی تالو سے لگتی ہی نہیں تھی اور جو ایک ایک اشارے سے ایک ایک داستان تیار کرتا تھا، آخر اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس کے تخیل کی اڑان کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو وہ یوں خاموش بیٹھا رہتا تھا گویا اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ دلّی کا تذکرہ بھی ختم تھا اور اخبار کی خبریں بھی معرض بحث میں نہیں آتی تھیں۔ سبّو میاں کا ذکر ہوتا لیکن بس ضرورت کے مطابق۔ علّن، رفیا، کالے خاں، تینوں گم متھان سے بیٹھے رہتے۔ علّن خاموشی سے کباب سینکتا رہتا۔ کوئی گاہک آ کر کباب مانگتا، علّن چپ چاپ سیخوں سے طشتری میں کباب اتارتا، ان پر پیاز چھڑکتا، چٹنی ڈالتا اور گاہک کے حوالے کرتا۔ گاہک کباب کھا کر پیسے ادا کرتا اور آگے بڑھ جاتا اور علّن پھر اونگھنے لگتا۔ اس کے چہرے پہ اب ایک ایسی افسردگی اور اضمحلال نظر آتا تھا جو اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ افسردگی کالے خاں کے چہرے پہ بھی نظر آتی تھی لیکن اس افسردگی میں ایک اضطراب، ایک بے چینی کی کیفیت بھی ملی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر اکثر یہ شبہ گزرتا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈھ لینے کے لئے بے تاب ہے۔ علّن کے برابر وہ گم سم بیٹھا رہتا۔ سڑک پہ چلتی ہوئی بھیڑ سے بے غرض، کبابوں کی خوشبو سے بے نیاز۔ اور وہ یکا یک چونک اٹھتا "ابے علّن۔"

علّن لاپروائی سے 'ہوں' کہتا اور آگ کو پنکھا کرنے لگتا۔

کالے خاں پوچھتا— ''یار کیا... شیر وچ مچ مر گیا؟''

رفیا ان الفاظ پہ اچانک چونکتا۔ پہلے وہ کالے خاں کو دیکھتا، پھر اس کی سوالیہ نگاہیں علّن کے چہرے پہ جام جاتیں۔

علّن کا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا۔ لیکن وہ آگ کو بدستور پنکھا کئے جاتا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہتا اور پھر آہستہ سے بڑے افسردگی آمیز لہجہ میں جواب دیتا۔ ''ہاں مر ہی گیا۔''

پھر خاموشی چھا جاتی۔ علّن انگاروں کو تیزی سے پنکھا کرنے لگتا۔ رفیا کا سر جھک جاتا کالے خاں ٹکٹکی باندھ کر خلا میں گھورنے لگتا۔

کالے خاں اس قسم کے بے تکے سوال اکثر کرتا اور خود بخود مطمئن ہو جاتا۔ علّن کی دکان پہ وہ بیٹھا رہتا۔ بیٹھا رہتا اور پھر ایک ساتھ وہاں سے اٹھتا اور جدھر منہ اٹھتا چل پڑتا۔ جب دور کسی سنسان سڑک پہ نکل جاتا تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر وہ کس مقصد سے ادھر آیا ہے۔ وہ پلٹتا اور پھر علّن کی دوکان پہ خاموش جا بیٹھتا۔ اس کی سمجھ میں اب اپنی اکثر باتیں نہیں آتی تھیں اور اب باتیں بھی کچھ اس قسم کی کرنے لگا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ حسن پور میں وہ کبھی سبطین کے پاس جا کر نہیں بیٹھا۔ حالانکہ سبطین کو اس وقت بھی عام لوگوں سے ناطہ قائم کرنے اور انھیں اپنی تحریک کے زیر اثر لانے کی دھن تھی۔ لیکن اب وہ سبطین کے پاس جا جا کر بیٹھا اور گھنٹوں اس کی باتیں سنیں۔ اس نے بڑے خلوص اور دیانتداری سے سبطین کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ مزمل نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ کالے خاں بھڑ کنے نہ پائے۔ اسے قطعی امید تھی کہ وہ تحریک کا بڑا مفید اور سرگرم بلکہ سرفروش رکن بن سکتا ہے۔ مگر کالے خاں کو رفتہ رفتہ وہاں بیٹھنے سے خفقان ہونے

لگا۔ آخر وہ رسہ تڑا کر بھاگ ہی نکلا۔ ایک مرتبہ بھاگ نکلنے کے بعد دوبارہ اس نے مزمل کی بات پہ کان نہیں دھرا اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ مگر سکون اسے علّن کی دکان پہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ آخر پہلے علّن اور رفیا کی صحبت اس کے لئے کیوں آسودگی کا سامان مہیا کرتی تھی اور اب کیوں اسے اس دکان سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس آشفتہ سری، اس اضطراب کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا سد باب کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ اضطراب محض باطنی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ظاہری اطوار میں بھی اک تبدیلی محسوس کی تھی اور تو اور اس کا ذائقہ تک بدلا جا رہا تھا۔ جس لطف سے وہ علّن کی باسی گڑ دھانیاں کھایا کرتا تھا اور چنوں کی پھنکیاں مارا کرتا تھا۔ اس لطف سے وہ اس کے بنائے ہوئے کباب کبھی نہ کھا سکا۔ ایک مرتبہ تو اس نے علّن سے کہہ بھی دیا۔ ''یار یہ تیرے کباب تو بالکل سیٹھے سیٹھے ہووے ہیں۔''

علّن نے جواب دیا۔ ''تو پیارے چٹنی ملا لیا کر۔''

اس پہ کالے خاں نے کہا۔ ''یار تیری چٹنی بھی گھاس ہووے ہے۔''

علّن کھسیا کر بولا۔ ''تو بھیا تو اپنے منھ کا علاج کرا۔''

ایک منھ پر منحصر نہیں۔ اس کے سارے جسم کا یہی حال تھا۔ آخر وہ علاج کیسے کراتا اور کیا کراتا۔ اس کا پورا جسم ٹوٹتا ہوا سا معلوم ہوتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اسے کسی سخت سی چیز سے ٹکرائے۔ کبھی کبھی اس میں یہ کواہش شدت سے جاگ اٹھتی کہ وہ کسی طوفان خیز سمندر کی بلند ہوتی ہوئی موجوں میں چھلانگ لگا دے اور پوری قوت سے ان سے لڑے۔ کبھی وہ اس پہ مائل ہوتا کہ بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور یا تو اس میں خود جل کر بھسم ہو جائے یا اپنے زور سے اس آگ کو بجھا دے۔ اسے اکثر

حسن پور کے آخری دن بھی یاد آتے تھے اور اس یاد کے ساتھ وہ انگاروں پہ لوٹنے لگتا۔ ایسے موقعوں پر اسے حق صاحب اور نمبر دار صاحب پر بہت غصہ آیا ہے۔ وہ اکثر ان کے ناموں کے ساتھ گالیوں کے اسماء صفت استعمال کر کے یہ شکایت کرتا تھا کہ انھوں نے مقابلہ نہیں ہونے دیا اور وقت سے پہلے بھاگ چھٹے۔ اب اس ایک غلطی کی تلافی کیسے کی جائے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اس کا کون اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتا تھا۔ سبطین کو وہ حق صاحب اور نمبر دار صاحب کی صف میں تو شمار نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی وہ کچھ ایسا خوش نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس نے رفیا سے کہہ ہی دیا— ''اے رفیا یہ تیرے سپومیاں جو ہیں یہ بس یونہی ہیں۔''

رفیا اس بات پہ بہت تپا— ''بات کیا ہے بے؟''

''بات کچھ بھی نہیں۔'' کالے خاں بولا۔ ''جنیں کیا آلھا اور دل گاوے ہیں۔ میرے پلّے تو کچھ پڑتا نئیں۔''

رفیا بولا— ''یار نو ون کی بات کیا سمجھے گا۔ پڑھوں لکھوں کی بات ہے وے اور تو ہے لٹھ۔''

''نہیں بے۔'' کالے خاں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''وے تو بالکل تیری طریوں گپ بازی کریں ہیں۔''

رفیا اس فقرے پہ بہت سرد ہوا۔ کالے خاں نے اسے جواب کا موقعہ نہیں دیا۔ کہنے لگا— ''یار میں تو یہ کہوں ہوں کہ بس دھت تیری کی اور دھت تیری کی لگے رگڑا اور مٹے جھگڑا۔''

رفیا نے بھن کر کہا— ''تو پیارے کشمیر چلا جا۔ واں خوب بج رئی اے۔ تیرے دل کے سارے ارمان نکل جاویں گے۔''

کالے خاں یہ فقرہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ علّن نے سیخ پہ قیمہ چڑھانا شروع کر دیا اور رفیا آگ جھلنے لگا۔

کالے خاں تھوڑی دیر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ایک ایکی بہت آہستہ سے وہ وہاں سے اٹھا اور ایک طرف کو ہولیا۔

رات کو جب رفیا اور علّن اپنی کوٹھری میں پہنچے تو اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد کالے کاں گھر لوٹا۔ رات اس کی خاصی بے چینی سے گزری۔ رفیا تو خیر بے خبر سوتا تھا، لیکن علّن کی جب آنکھ کھلی اس نے کالے خاں کو کروٹیں بدلتے پایا۔ ایک مرتبہ اس نے ٹوکا بھی— ''بے کالے خاں کیا بات ہے؟''

کالے خاں نے جواب دیا— ''بہنچ نیند نہیں آتی۔'' اور یہ کہہ کے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صبح کو کالے خاں نے اعلان کیا کہ ''یار میں پنڈی جا رہا ہوں۔''

رفیا اور علّن دونوں خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔ علّن نے پوچھا— ''کیوں؟''

''واں سے کشمیر جاؤں گا۔''

رفیا اور علّن دونوں کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئیں۔

آخر رفیا بولا، ''پر سپّو میاں یوں کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں لڑائی بند ہو رئی اے۔''

کالے خاں نے فوراً جواب دیا— ''یار میں جھوٹ نئیں کہتا۔ یہ تیرے سپّو میاں بیٹھے بیٹھے بس گپ بازی کیا کریں ہیں اور ون سے کچھ نئیں آتا۔''

اور یہ کہہ کے اس نے اپنا بستر لپیٹنا شروع کر دیا۔

— ● — ● —

(10)

۳۱/ دسمبر۱۹۴۸ء

گلی خاموش ہے۔ کہیں دور سے ایک کتے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ رات گہری ہو چلی ہے۔ اس وقت بارہ کا عمل ہوگا۔ اپنے پاس گھڑی تو ہے نہیں۔ جب گھڑی پاس نہ ہوتو پھر فضا کے سناٹے اور کتوں کی آوازوں سے ہی وقت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

آج میں نے اپنی ڈائری عجب انداز میں شروع کی ہے۔ دن کے سارے ہنگاموں اور سرگرمیوں کو چھوڑ کر میں رات کا ذکر لے بیٹھا ہوں اور رات کے بھی وہ لمحے جنہیں ۳۱ دسمبر کے آخری سانس کہنا چاہیے۔ خیر یہ بات عجیب سہی غلط تو نہیں ہے۔ رات کے سناٹے سے بڑا ہنگامہ میرے تصور میں نہیں آتا۔ رہیں دن کی سرگرمیاں سو یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ آدمی چراغ لے کے ہوا سے لڑنے نکلے۔ دن کیا، دن کے ہنگامے کیا۔ ہر سرگرمی کی تان جمود ہی پر ٹوٹتی ہے۔ سارے ہنگامے

خاموش ہو جاتے ہیں۔ بس ایک خاموشی کا ہنگامہ کبھی خاموش نہیں ہوتا۔

...دن کے بارے میں کیا لکھوں۔ آج دن میں کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں جس کا تذکرہ کیا جائے۔ آج کا دن تو تاریخی نہ تھا۔ لیکن آج کی رات ضرور تاریخی ہے۔ ۱۹۴۸ء نے لوٹ پیٹ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر ہی لئے۔ اس کے پیٹ سے ایک ادھ مرا بچہ پیدا ہوا ہے۔ ۱۹۴۹ء! فضا کی نبض ڈوبتی جاتی ہے۔ رات خاموش ہے۔ کشمیر کے محاذ پر بھی اب خاموشی چھا گئی ہوگی۔ جو مجاہدین سر پہ کفنیاں باندھ باندھ کر میدان میں پہنچے تھے انہوں نے اب تلواریں نیاموں میں ڈال لی ہوں گی اور چپ چاپ اپنے خیموں کو واپس آ رہے ہوں گے میں سوچتا ہوں کہ اس وقت ان پر کیا کیفیت گزر رہی ہوگی۔ جنگ کے خاتمہ پر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا یا انھوں نے ایک کرب محسوس کیا ہوگا۔ مگر یہ تو جزوی بات ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ لڑائی ختم ہو گئی۔ رات خاموش ہے۔ فضا کی نبض ڈوبتی جاتی ہے۔ دور سے کسی اکیلے کتے کے رونے کی آواز برابر آئے چلی جا رہی ہے۔ ہم لوگوں سے تو یہ کتا ہی زیادہ حساس نکلا۔ کتے آدمی کی نسبت یوں بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں اور آدمی بے حس ہو جائے تو پھر وہ اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دن کی روشنی میں ان سے زیادہ بے حس اور ذلیل مخلوق کوئی نظر نہیں آتی۔ ان کے جگر کی ساری تپش ان کے دل کا سارا درد کالی راتوں کے سناٹے میں پوری شدت کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔ آخر وہ راتوں کو کیوں اتنے درد سے روتے ہیں اور وہ کون سی شے ہے جو ان کے نالوں میں اتنا سوز، اتنا کرب پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سوال واقعی غور کرنے کا ہے مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔ کیا دماغ اور کیا آنکھیں انسان کے سارے حواس رات کے جادو کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ میری آنکھیں بند

ہوتی جا رہی ہیں۔ اب مجھے سو جانا چاہیے۔

— ● — ● —

فیاض خاں نے ڈائری بند کر کے تکیہ کے نیچے رکھ لی اور چپکے سے لحاف میں دبک گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لیکن جب اس کی کنپٹی پہ کھجلی ہوئی تو صرف اس کے ہاتھ نے ہی جنبش نہیں کی بلکہ اور دوسرے اعضا بھی بیدار ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور سکڑی ہوئی ٹانگوں کو پھیلایا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں بلکہ اس مرتبہ تو اسے جھپکی بھی آ گئی تھی۔ لیکن کسی نامعلوم کھٹکے سے اس کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔ اس نے فوراً ہی پھر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مگر ذہن بھی عجب بے قابو شے ہے ایسی آہستگی سے آنکھ بچا کر نکلتا ہے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ان بھولے بسرے رستوں پہ چل پڑتا ہے جنہیں حافظہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر چکا ہوتا ہے۔ جانے اسے ان دو پٹھانوں کا خیال کیسے آیا جنہیں اس نے کاندھے پہ بندوق رکھے مال روڈ پہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھا تھا اور جو کشمیر جانے کے لئے سرگرداں پھر رہے تھے اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان پٹھانوں کی تقریب سے اسے کالے خاں کا خیال آیا۔ ان پٹھانوں اور کالے خاں مین بس ایسا ہی رشتہ تھا جیسا چوراہے کی اینٹ اور ترازو کے بانٹ میں ہوتا ہے۔ لیکن تصور پہ کسی کا کیا بس ہے۔ فیاض خاں کو کالے خاں کا خیال آیا اور اسی تقریب سے آیا۔ کالے خاں کا خیال آتے ہی وہ بے ساختہ مسکرا پڑا۔ عجیب بہنگم شخص ہے۔ سمجھتا ہے کہ نام کے ساتھ خان لگانے سے وہ واقعی

پٹھان بن جائے گا۔ بھلا نام میں کیا رکھا ہے۔ پٹھانی نام کا نہیں مزاج کا نام ہے۔
اب میرا ہی نام ہے اس میں سے میں خان کا لفظ اڑا دوں تو فرق کیا پڑتا ہے۔ اس
خیال کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے نام کے آگے سے خان کا لفظ واقعی اڑا دیا اور خالی
'فیاض' کا تصور کرنا چاہا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک مرغا ہے جس کا کیس یکا یک
غائب ہو گیا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ 'خان' مرغ کا کیس ہوتا ہے۔ کیس اڑا دیجئے۔ مرغا
غریب گنجا رہ جاتا ہے۔ کیس مرغوں کی نسلی علامت ہے، قومی نشان ہے۔ اس کا خیال
بھٹک کر کسی دوسری طرف جا نکلا۔ حد نگاہ تک اونچی نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔
مرغوں کا ایک غول ان چوٹیوں پر حرکت کرتا نظر آ رہا تھا ان کے کیس غائب تھے اور وہ
سر نیوڑھائے آنکھیں بند کئے چپ چاپ ڈھلوانوں پر اترتے چلے جا رہے تھے۔
فیاض خاں نے جسم پہ سے کمبل الٹ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر
رفتہ رفتہ اسے سردی لگنے لگی اور وہ ایک ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوٹ کے تسمے باندھے
اپنا موٹا کوٹ پہنا اور صحن میں نکل آیا۔ ستارے کچھ مند گئے تھے، کچھ مند رہے تھے۔
ایک بڑے رقبہ میں دھندلے ستاروں کے ادغام سے کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی گویا
کسی قافلہ نے یہاں چولہے روشن کئے تھے۔ وہ قافلہ گزر گیا ہے اور وہ چولہے اب
بجھے پڑے ہیں۔ بعض بڑے بڑے ستارے کچھ یوں بے نور ہو گئے تھے گویا روشن
آنکھیں یکا یک پتھرا گئی ہوں۔ البتہ صبح کا ستارہ اب تک جگر جگر چمک رہا تھا۔ دور افق
پر اندھیرا اور اجالا مل کر کچھ سازش کر رہے تھے۔ فیاض خاں صحن سے نکل کر سڑک پر آ
گیا اور آگے چل پڑا۔ سڑک کاموش تھی۔ اس خاموش ماحول میں اسے صرف دو
آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اپنے بھاری بوٹوں کی آواز اور اپنے دل کے دھڑکنے
کی آواز۔ اس نے اور تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ مختلف موٹروں سے گزرنے کے

بعد وہ ایک طول طویل سڑک پہ ہولیا۔ نہر کے پل پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ وہ پھر نہر کی سڑک پہ پڑ لیا۔ رات کی تاریکی ڈھل چکی تھی۔ فضا میں ہر طرف ایک لطیف قسم کا سفید دھند چھایا ہوا تھا۔ نہر کے پانی پر دور تک سفید غبار منڈلاتا نظر آ رہا تھا۔ فیاض خاں کو پہلے تو یہ نظارہ بھلا لگا، مگر پھر اس کی یکسانیت سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ نہر ہر جگہ ایک سی کیوں ہے۔ اس میں نشیب و فراز اور پیچ و خم کیوں نہیں ہیں اور کناروں پر ہر چند قدم کے بعد ایک درخت کیوں آتا ہے۔ کیا یہ درخت قدم ناپ کر لگائے گئے ہیں۔ فطرت کا وحشیانہ پن آخر کہاں گیا۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہے کہ پھولوں کے درخت جہاں ہوں وہاں اکٹھے ہوں اور اتنے ہوں کہ پھولوں کی ڈالیوں کے بوجھ سے پانی کا دم رکنے لگے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے قدم سڑک کی دوسری سمت میں مڑنے لگے۔ سڑک سے نیچے دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور اس سبزے پر کہرے کی ہلکی دودھیا چادر بچھی ہوئی تھی۔ سڑک سے اتر کر وہ اس سبزے پہ چلنے لگا۔ گھاس کے ایک شاداب ٹکڑے پر پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولے اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پہ پاؤں رکھ دیے اس نرم اور ٹھنڈی گھاس کے لمس میں اسے کچھ اس قدر لطف آیا کہ اس کا بے تحاشا یہ جی چاہا کہ پورے جسم سے اس لمس کو محسوس کیا جائے وہ زمین پہ پٹ لیٹ گیا اور اپنا منہ شبنم آلود گھاس پہ رکھ دیا۔ کئی منٹ تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سینے کے ساتھ ساتھ اس کے سینے کے نیچے والی زمین کا سینہ بھی دھڑک رہا ہے اس نے آسمان پہ بے کیفی اور بے حسی کی جو کیفیت دیکھی تھی۔ اس سے یہ کیفیت بالکل مختلف تھی۔ گھاس برف کی طرح ٹھنڈی تھی مگر اس نرم اور سرد گھاس کے نیچے اس نے حرارت اور حرکت کو محسوس کیا۔ یہ تجربہ اس کے لئے نیا بھی تھا اور تسلی بخش بھی۔ اس

نے اب تک زمین کو اپنے قدموں سے روندا تھا۔ اس کی نرمی اور حلاوت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ ایک لطیف سے سرد لباس میں ملبوس کوئی نرم گرم چیز اسے اپنی آغوش میں لئے لے رہی ہے اور وہ اس میں گم ہوا جا رہا ہے۔ اس پر ایک شیریں غشی سی چھائی جا رہی ہے۔ یکا یک ایک خفیف سے کھٹکے سے اس کا دھیان بٹ گیا۔ وہ بہت چونکا تو نہیں مگر آہستہ سے آنکھیں ضرور کھول دیں۔ سورج نکل آیا تھا۔ نرم سنہری شعاعیں گھاس کے گدگدیاں کر رہی تھیں۔ تھوڑے سے فاصلہ پر کوڑے کے ایک ڈھیر پر جنگلی کبوتروں کا ایک غول اتر آیا تھا اور بڑی سرگرمی سے اس میں سے دانے چگ رہا تھا۔ دانہ چگتے چگتے ان کے سراپا حرکت جسم بار بار اتنے قریب آ جاتے کہ بس یوں لگتا کہ زمین پہ کسی نے بہت سا سرمہ بکھیر دیا ہے اور اس میں برقی لہریں پیدا ہو گئی ہیں۔ پاس ہی کوؤں کی بھی ایک ٹولی مٹر گشتیاں کرتی پھرتی تھی۔ کبوتروں کا غول آپ ہی آپ بھرا کھا کے اڑ گیا۔ کوؤں کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ بھی وہاں سے اڑ لئے۔ ایک کوے کا بازو لٹک گیا تھا۔ اس نے پہلے تو اڑنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اس کوشش میں ناکام رہا تو بہت دور تک گھاس پہ دوڑتا چلا گیا۔ مگر کوے دور نکل گئے تھے اور وہ تھک کر پھر رینگنے لگا۔ فیاض خاں بہت دیر تک اس اپاہج کوے کو دیکھتا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ خود اس کا بازو بھی لٹک گیا ہے۔ کسی غلیلچی کے غلہ نے اس کا بازو توڑ کر رکھ دیا ہے اور کوؤں کی باقی برادری سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس وقت پہلی بار اس کے دل میں خیال آیا کہ اس نے اپنی زندگی بلا وجہ ضائع کی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی درشتی اور شدت سرد پڑ گئی اس کی جگہ ایک افسردہ سی کیفیت نے لے لی۔ افسردگی کے ساتھ ساتھ اس خیال نے اور زور پکڑا۔ اس کے جسم کے کسی نامعلوم کونے سے ایک آواز آ رہی تھی۔ ''زندگی ضائع ہو گئی۔

زندگی ضائع ہوگئی۔'' پہلے اس نے اس آواز کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ اس پر غلبہ پانا چاہا۔ لیکن اس آواز کا زور بڑھتا گیا۔ اور وہ پسپا ہو کر مضمحل ہونے لگا۔ عین اسی عالم میں اسے افسری کا خیال آیا۔ وہ پکا ہوا پھل جو اس کی گودی میں آ گرا تھا اور جسے اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ کاش وہ وقت پھر واپس آئے اور ایک مرتبہ پھر... مگر اس خواہش کا گلا اسی آواز نے گھوٹ دیا جو اس کے جسم کے نامعلوم کونے سے بلند ہو رہی تھی اور جو کہہ رہی تھی، ''زندگی ضائع ہوگئی۔ وقت بیت گیا۔'' اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دھیان بٹانے کی خاطر ایک مرتبہ پھر اس کیفیت کو محسوس کرنا چاہا جس کا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تجربہ کر چکا تھا مگر وہ دھڑکتی ہوئی آغوش جو تھوڑی دیر پہلے اسے بھینچ لینے کے لئے بے تاب تھی، اب سمٹ گئی تھی۔ زمین کی وہ سوندھی سوندھی خوشبو، وہ نرمی وہ حلاوت غائب ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی گھاس پہ لیٹے لیٹے اسے جاڑا لگنے لگا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے پیروں میں بوٹ ڈالے، ان کے تسمے باندھے اور اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ بہت دیر تک بے مقصد، بے مطلب گھومتا رہا۔ مگر اب اس کی چال میں وہ تندی، وہ زور شور باقی نہیں تھا۔ کئی مرتبہ اسے اپنی سست روی پر جھنجھلاہٹ ہوئی اور اس نے نیت باندھ کر تیز رفتاری سے چلنا چاہا۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ تیز نہ چل سکا۔ اس کی چال میں ایک اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ دیر تک وہ مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ سنسان سڑکوں سے گزر کر وہ آباد گلیوں میں پہنچ گیا۔ چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے آپ کو حق صاحب کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ اپنی اس غیر شعوری حرکت پہ حیران بھی ہوا اور اسے غصہ بھی آیا۔ اس نے وہاں سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی۔ لیکن دو قدم چل کر اس کے پاؤں پھر رک گئے۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لئے ہیں۔ سامنے دریچے میں ایک سایہ سا نظر آیا اور

اوجھل ہو گیا۔ وہ صورت اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ افسری تھی اور اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں اس نے اس حال میں اسے دیکھ تو نہیں لیا ہے۔ محض خفت مٹانے کی غرض سے اس نے جلدی سے بڑھ کر دروازے پہ دستک دے دی۔ تھوڑی دیر میں نوکرانی نکل کر آئی اور پوچھنے لگی — ''کون ہے جی؟''

فیاض خاں نے مختصر سا جواب دیا — ''کہو کہ فیاض خاں آیا ہے۔''

نوکرانی اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی — ''وکیل صاحب گھر پہ نہیں ہیں۔ بیگم صاحب کہتی ہیں کہ جب وہ آئیں گے تو آپ کا نام بتا دیں گے۔''

فیاض خاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کسی نے یکا یک اس کے جسم کی روح سلب کر لی تھی۔ کئی منٹ تک وہ بالکل گم سم کھڑا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وہاں سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

— • — • —

(11)

اخبار بند ہو جانے کے بعد سبطین پر کئی دن تک بے حسی کی کیفیت طاری رہی۔ اس پہ نہ تو غم کا ایسا دورہ پڑا جو حسن پور میں ''انقلاب'' کے بند ہونے پر پڑا تھا اور نہ اس نے غصہ کی ضرورت محسوس کی۔ اسے بس یوں معلوم ہوا کہ کوئی چیز کھو گئی ہے، ٹوٹ گئی ہے، جس کا دوبارہ حاصل ہونا مشکل ہے۔ ملال اور افسردگی کی اک گہری کیفیت نے اسے آدبوچا۔ اس کیفیت نے چند دنوں کے لئے اس کی سوچ کو بھی معطل کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ اس حادثے پر واضح طور پر سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ اس کی آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگے اور ذہن مین خاک سی بھر گئی۔ چیزوں کا وجود اس کی نظروں میں دھندلا گیا تھا اور اسے مبہم طور پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ایک خلا کا احساس تھا جو اس کے عقل و ہوش پر چھا گیا تھا۔ شاید اس کی دنیا میں اب دن اور رات بھی باقی نہیں رہے تھے۔ وہ دن میں کسی وقت بھی چادر تان کر لیٹ جاتا اور سنانے لگتا۔ وہ سوتا رہتا، سوتا رہتا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔ پھر کسی وقت رات

گئے وہ اٹھ بیٹھتا اور صحن میں ٹہلتا اور سارے وہ کام کرتا جو دن سے مخصوص ہیں۔ مزمل، اجمل اور فیاض خاں کو دیکھ کر کبھی کبھی گمان گزرتا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں اور اس سے ملنے آئے ہیں۔

پھر رفتہ رفتہ یہ بے حسی کی کیفیت ختم ہوئی۔ اس کے ذہن کی دھندلاہٹ مٹنے لگی۔ اور چیزوں کی شکلیں اس کی نگاہ میں واضح ہوتی گئیں۔ بے حسی اور ابہام کی جب یہ کیفیت ختم ہو چکی تو سوچ بچار کی وہ پرانی عادت پھر عود کر آئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شدت سے سوچنا شروع کیا کہ اخبار کا بند ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کے دوبارہ اجرا کی کیا صورت ہو سکتی ہے وہ ساری اسکیم مرتب کر لیتا اور ساری چولیں بٹھاتا چلا جاتا۔ مگر آخر میں سوال پیسے کا اٹھ کھڑا ہوتا اور ساری عمارت نیچے آ گرتی۔ وہ پیسے کا مسئلہ کبھی حل نہ کر سکا۔ اس کے لئے اس نے حق صاحب اور نمبردار صاحب پہ تکیہ کیا تھا اور یہ دونوں بزرگ باتوں سے سونے کے محل کھڑے کرتے تھے اور عمل کے موقعہ پر صاف کنی کاٹ جاتے تھے۔ سبطین چونکہ باتوں کا بادشاہ تھا۔ اس لئے وہ ان ہوائی قلعوں کو ٹھوس حقائق کے برابر بلکہ ان سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ مگر اب اس آخری شکست نے ان ہوائی قلعوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ سبطین کو اب یہ جرأت نہیں پڑتی تھی کہ پیسے کے سوال کو بالائے طاق رکھ کر کوئی منصوبہ بنائے۔ اس نے اس مسئلہ پر بھی بہت سوچ بچار کیا کہ آخر قوم اسے چندہ کیوں نہیں دیتی۔ اس سوال پر سوچتے ہوئے اسے اپنی ذات پر بھی بار بار شک گزرا۔ اسے پہلے تو اپنے خلوص پر شبہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ مسلمان عوام کی جبلت ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے۔ وہ جب کسی کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں تب بھی راستی پر ہوتے ہیں اور جب کسی کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالتے ہیں تب بھی راستی پر ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک رہنما خلوص

قلب اور نیک نیت کے ساتھ ان کے پاس جائے اور وہ اس کی راہ میں آنکھیں نہ بچھائیں مگر جب اس نے خلوص کو چندے کے سوال سے متعلق کر کے سوچنا شروع کیا تو اسے اپنے عقیدے کی عمارت بیٹھتی نظر آنے لگی۔ کیا وہ سارے رہنما جو ہر تقریر پہ اپنا دامن بھر لیتے ہیں پرخلوص ہوتے ہیں۔ کیا قوم جنہیں چندہ دیتی ہے، وہ ہمیشہ اس کا جائز خرچ کرتے ہیں۔ فیاض خاں ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ سب احمق سازی کا کھیل ہے۔ قوم اپنے رہنماؤں کو احمق بنانا چاہتی ہے اور رہنما اپنی قوم کو احمق بنانا چاہتے ہیں۔ دونوں میں سے جس کا بس چل جاتا ہے۔ سینے پہ چڑھ بیٹھتا ہے۔ مگر سبطین ایسی بے ڈھب توجیہات کا قائل نہیں تھا۔ اس نے اس پورے سوال کو گورکھ دھندا سمجھ کر چھوڑ دیا اور پھر دوسرے ہی پہلو سے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔

اخبار کے دوبارہ اجرا کی جب صورت نظر نہ آئی تو پھر سبطین نے تحریک کو دوسرے طریقوں سے چلانے کے امکانات پر غور شروع کیا۔ کئی تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں اور انھیں اس نے رد کر دیا۔ ایک یہ تجویز بھی اس کے ذہن میں آئی کہ گاؤں گاؤں گھوم کر تقریریں کی جائیں اور لوگوں تک اپنی بات پہنچائی جائے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ خالی تقریروں سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ٹھوس کام کرنا چاہیے۔ ٹھوس کام کی تلاش میں اس کا ذہن ایک اور طرف نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ قائم کرنی چاہیے۔ ایسی درس گاہ جو ایک مدرسہ فکر بن جائے، ایک زبردست قومی ادارے کی شکل اختیار کر لے۔ اس سلسلہ میں اس نے اگلی، پچھلی ساری مسلمان درسگاہوں کے نظام کا جائزہ لے ڈالا۔ موجودہ مسلمان درس گاہوں میں کسی کے نظام نے اسے اپیل نہیں کیا۔ کسی کو اس نے مغرب زدہ کہہ کر رد کیا اور کسی کو اس نے دقیانوسی نظام قرار دیا۔ ان درس گاہوں کے متعلق سوچتے سوچتے اس کا ذہن

'شانتی نکیتن' کی طرف رجوع ہو گیا۔ اس کے نظام نے اسے بہت متاثر کیا۔ اسے اس پہ ایک ہی اعتراض تھا کہ اس کی فضا مخصوص طور پر ہندو ذہنیت کی ترجمان ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ شانتی نکیتن کے طرز پر قائم کرنی چاہیے۔ مگر اس کی فضا کی بو باس اسلامی ہونی چاہیے۔ اس سے سادھو نہیں نکلنے چاہئیں۔ بلکہ مجاہدین اور عمل کی تعلیم دینے والے مفکرین پیدا ہونے چاہئیں۔

سبطین نے جب مزمل اور اجمل کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو انھوں نے کچھ ایسی گرمجوشی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ اب تک تو ان کی روش یہی رہی تھی کہ جب سبطین پھریری لیتا تو وہ بھی پھریری لیتے اور جب سبطین افسردہ ہوتا تو وہ بھی افسردہ ہوتا تو وہ بھی افسردہ ہو جاتے۔ مگر اس مرتبہ ان کی افسردگی دیرپا ثابت ہوئی۔ اخبار کے بند ہو جانے نے ان میں ناکامی کا ایسا احساس پیدا کیا تھا جو یوں فرو ہونے والا نہ تھا۔ سبطین جب کبھی نیا منصوبہ پیش کرتا تو اس میں امید کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی اور یہ لہر اس کے اردگرد بیٹھنے والوں میں بھی گرمی پیدا کر دیتی۔ لیکن آج سبطین پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا منصوبہ بیان کر رہا تھا اور اجمل اور مزمل چپ تھے۔ ان کے چہروں پہ بدستور ایک افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ سبطین اپنا پورا منصوبہ بیان کر چکا۔ وہ بدستور چپ رہے۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کی تبدیلی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

آخر سبطین نے انھیں ٹوکا — ''میاں چپ کیوں ہو۔ کچھ بولو نا۔''

مزمل جماہی لیتے ہوئے بولا — ''کیا بولیں؟''

سبطین نے پھر جوش میں آ کر کہا — ''اماں بتاؤ نا کہ کیسی اسکیم ہے۔''

''بہت اچھی ہے۔'' مزمل نے آہستگی سے جواب دیا۔

اجمل نے ٹکڑا لگایا۔ ''اچھی ہے اور بس۔''

''کیا مطلب؟'' سبطین نے چونک کر اجمل کو دیکھا۔

مزمل نے جواب دیا۔ ''مطلب یہ ہے کہ یہ محض اسکیم ہے۔ ہم اسے عمل میں نہیں لا سکتے۔''

''کیوں نہیں لا سکتے؟'' سبطین کا لہجہ درشت ہو چلا تھا۔

مزمل بے اعتنائی سے بولا۔ ''بس لا نہیں سکتے۔''

سبطین اور گرمایا۔ ''بس لا نہیں سکتے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ گر عزم ہو تو کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

مزمل نے اسی سرد مہری سے جواب دیا۔ ''عزم ہو تو سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم اس کے بل پر ایک ہفتہ وار پرچہ نہیں چلا سکے۔''

سبطین نے اسی جوش سے جواب دیا۔ ''ہماری ایک چھوٹی سی ناکامی سے اصول نہیں ٹوٹ سکتا۔''

''مگر ہماری چھوٹی چھوٹی بہت سی ناکامیوں سے ایک اور اصول قائم ہوتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ......'' مزمل ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ''خالی عزم محض اک ڈھکوسلا ہے۔''

فیاض خاں رضائی تانے خاموش لیٹا تھا۔ اس نے اب تک اپنی کسی حرکت سے یہ ثابت نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مزمل کے آخری فقرے پر اس نے کمبل کا ایک کونہ الٹا۔ وہ چند لمحوں تک غور سے مزمل کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے کمبل میں منھ ڈھک لیا۔

سبطین بھی اب خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے والی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر آ ٹکی۔ تھوڑی دیر وہ یوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر یوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ کھڑ پڑ کی مسلسل آواز پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اجمل اور مزمل اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ وہ ان کی نقل و حرکت خاموشی سے دیکھتا رہا۔ انھیں ٹوکنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ فیاض خاں کے کمبل کا کونہ ایک مرتبہ پھر اٹھا۔ وہ ڈیڑھ دو منٹ تک چپ چاپ اجمل اور مزمل کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا— ''مزمل اس وقت یہ کیا کر رہے ہو؟''

مزمل نے خشک سی آواز میں جواب دیا— ''بات یہ ہے کہ ہم سوچتے ہیں کہ...'' مزمل رکا اور پھر بولا— ''ہم سوچتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو وقت خواہ مخواہ ضائع...'' مزمل فقرہ پورا نہ کر سکا۔

فیاض خاں اجمل سے مخاطب ہوا— ''اجمل تم بھی؟''

اجمل نے سر جھکا کر جواب دیا— ''جی۔''

فیاض خاں ٹکٹکی باندھے مزمل اور اجمل کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہیں خلا میں جم گئیں۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ دھندلکا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور چیزوں کے خد و خال دھندلے پڑتے جا رہے تھے، پگھلتے جا رہے تھے، بلکہ پوری فضا کو ہی دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ پگھل رہی ہے۔ دور کی کسی مسجد سے اذان کی آواز اونگھتی رینگتی یوں آ رہی تھی جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر دو قدم چلتا ہے اور تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ اذان کی آواز کبھی کبھی ذرا تیز ہو جاتی اور پھر مدھم ہو جاتی اور اتنی مدھم ہوتی کہ اسے ہوا کی لہریں سامعہ تک

پہنچنے سے پہلے جذب کر لیتیں۔ مزمل اور اجمل نے بستر کاندھے پر رکھے، ہاتھوں میں صندوقچے سنبھالے، خاموشی سے سبطین اور فیاض خاں کو سلام کیا اور سر نیوڑھائے آہستہ سے باہر نکل گئے۔ فیاض خاں اور سبطین تھوڑی دیر تک خاموش انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو فیاض خاں نے کمبل میں منھ لپیٹ لیا اور سبطین نے گھٹنوں میں سر دے لیا۔

شام کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ گلشن لالٹین جلا کر لائی اور اسٹول پر رکھتے ہوئے بولی— ''سبّو میاں کھانا لے آؤں۔''

''لے آؤ۔'' اس نے گھٹنوں سے سر اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

گلشن بولی— ''پرے مزمل میاں اور اجمل میاں جنیں کدھر چلے گئے۔''

سبطین گھٹنوں میں سر دیے دیے بولا— ''وہ گئے۔''

''گئے؟ کاں گئے؟'' گلشن کے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ گئے۔ کھانا لے آؤ۔'' سبطین کا سر بدستور گھٹنوں میں تھا۔

گلشن بھوچکی رہ گئی۔ اس نے پہلے بڑی حیرت سے سبطین کو دیکھا۔ پھر فیاض خاں کی چارپائی پہ نظر ڈالی اور پھر دبے پاؤں باہر نکل گئی۔

گلشن جب کھانا لے کر آئی تو سبطین نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور فیاض خاں کو آواز دی— ''فیاض خاں کھانا کھا لو۔'' فیاض خاں خاموشی سے اٹھا، کلّی کی، ہاتھ دھوئے اور کھانے پہ ڈٹ گیا۔ وہ نوالے آج بھی بڑے بڑے لے رہا تھا، لیکن جس تیزی سے وہ نوالوں پہ نوالے کھایا کرتا تھا۔ وہ تیزی آج غائب تھی۔ وہ آہستہ سے ایک بڑا سا نوالہ توڑتا شوربے میں ڈبوتا اور منھ میں رکھ لیتا۔ وہ اسے چباتا رہتا، چباتا رہتا اور جب نوالہ بالکل ختم ہو جاتا، پھر دوسرا نوالہ توڑتا۔ کھانے کے دوران میں کوئی

گفتگو نہیں ہوئی۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، کلی کی اور پڑ رہے۔

سبطین کی بیٹھک میں صبح آج کچھ بہت ہی خاموشی سے آئی۔ مزمل اور اجمل جو منہ اندھیرے اٹھ کر ساری بیٹھک کی فضا میں جاگ باگ پیدا کر دیتے تھے، رخصت ہو چکے تھے۔ فیاض خاں کہاں تو تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ٹہلنے نکل جایا کرتا تھا، کہاں اب اس نے یہ طور اختیار کیا تھا کہ پوستیوں کی طرح دن چڑھے تک کمبل میں منہ لپیٹے پڑا رہتا تھا۔ کمرے میں ایک اداس سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کتابیں اور کاغذ بے ترتیبی سے چٹائی پہ بکھرے پڑے تھے۔ اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے اور بہت سہم سہم کر اس احتیاط سے کہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ نہ سن لے۔ مگر سبطین نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے منہ کھول کر بھی دیکھا مگر اس اداس اجالے سے ڈر کر پھر منہ ڈھک لیا اور فیاض خاں تو شاید ابھی صبح کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایک فراغت کے احساس کے ساتھ وہ منہ لپیٹے پڑا تھا۔ اجالا ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی تو اس نے منہ کھول کر باہر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ البتہ جب اخبار والا اخبار ڈال کر گیا تو سبطین کو چار و ناچار اپنے جاگ اٹھنے کا ثبوت دینا پڑا۔ اخبار پڑھنے کا اس کا وہ اشتیاق آج بالکل ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ رسم کو تو نبھا ہی رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے خبروں پہ نظر ڈالنی شروع کر دی۔ مختلف سرخیوں کو وہ پڑھتا چلا گیا۔ مگر اسے پتہ نہ چل سکا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ کئی ایک سرخیوں پر جب اس نے دوبارہ نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے پہلے انھیں پڑھا ہی نہیں تھا۔ ایک طول طویل خبر کو وہ بہت غور سے پڑھتا چلا گیا۔ لیکن اسے ختم کر چکنے کے بعد وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ خبر کس بارے میں تھی۔ بعض خبروں کو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ایک سرخی کے الفاظ کے متعلق

اسے یوں محسوس ہوا کہ ان کی روشنائی پھیل گئی ہے اور وہ آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ البتہ ایک کونے میں ایک مختصر سی ایک کالمی خبر پر اس کی نظریں ٹھٹکیں۔ اس نے بڑی توجہ سے اسے پڑھا۔

''مظفر آباد، ۱۷ جنوری

اطلاعات مظہر ہیں کہ ہندوستانی فوجیں برابر ایسے جارحانہ اقدامات کر رہی ہیں جو معاہدۂ ترکِ جنگ کے خلاف ورزی ہیں۔ آج خبر آئی ہے کہ انھوں نے کل اس قسم کا جارحانہ اقدام پھر کیا اور ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ انھوں نے الزام لگایا ہے کہ یہ شخص ان کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مقتول کی سیدھی کلائی پر تلوار کا نشان کھدا ہوا ہے اور اس کے نیچے اس کا نام ''کالے خاں'' کھدا ہے۔''

سبطین کئی منٹ تک بالکل چپ بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ بولا— ''لو بھئی کالے خاں مارا گیا۔''

فیاض خاں نے منھ کھول کر سبطین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سبطین نے جواب میں اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ فیاض خاں نے خبر خود تلاش کر کے پڑھی۔ دوسری خبریں پڑھنے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے خاموشی سے اخبار سرہانے رکھ دیا اور پھر منھ کمبل میں لپیٹ لیا۔

رفیا جب کمرے میں آیا تو پہلے سبطین اسے خاموشی سے دیکھتا رہا— ''ارے بھئی رفیا...وہ تمھارا کالے خاں تھا نہیں....''

رفیا چونکا— ''ہاں جی؟ ؤس کی کوئی خبر آئی ہے؟''

''ہاں خبر آئی ہے...وہ مارا گیا۔''

رفیا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ مجسم سوال بنا سبطین کو دیکھ رہا تھا۔ مگر جب سبطین نے کوئی اور بات نہ کی تو وہ آخر خود ہی بولا — ''سپّو میاں وے تو پنڈی گیا تھا۔''

''وہاں سے وہ کشمیر چلا گیا۔ وہاں ہندوستانی فوج نے اس کے گولی ماردی۔''

رفیا دیر تک بت بنا کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے وہاں سے نکل گیا۔

کوٹھری میں پہنچتے ہی اس نے علّن کو بڑی یاس آمیز آواز میں مخاطب کیا —

''یار علّن وہ... کالے خاں...'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

علّن گھبرایا — ''کیا ہوا بے؟''

''کالے خاں مارا گیا۔''

''کالے خاں مارا گیا؟... کون کہوے ہے بے؟''

''سپّو میاں... اخبار میں آیا ہے۔''

علّن خاموش ہوگیا۔ پھر بولا — ''کیا لکھا ہے؟''

''لڑائی میں، گولی لگ گئی۔''

رفیا کا منھ دوسری طرف ہوگیا۔ علّن کی طرف پیٹھ کئے وہ چپ چاپ دیر تک بیٹھا رہا۔ علّن کی زبان بھی بند تھی۔ پھر وہ بہت آہستہ سے بولا — ''میں نے وُ سے پہلے ہی منع کیا تھا۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ رفیا علّن سے نگاہ بچا کر سامنے والی دیوار کو بے معنی طور پر گھور رہا تھا۔ علّن کی نگاہیں خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ ان کی زبانیں سل گئی تھیں۔ دو خاموش بے حس و حرکت سائے!

— ● — ● —

(12)

۱۸؍ جنوری

کالے خاں مارا گیا۔ اس خبر نے مجھ پہ کچھ عجیب ہی اثر کیا ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر مجھے کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس بے جگری سے موت سے ٹکرا سکتا ہے۔ اس زمانے میں لوگ یا تو اچانک ہیرو بن جاتے ہیں یا پھر میری ہی نظر میں فتور ہے۔ اس شخص کو میں روز دیکھتا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں مجھے کبھی کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ اور ایک روز وہ خاموشی سے میرے پاس سے اٹھا اور موت پر جھپٹ پڑا۔ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے آج حضرت علیؓ کا ایک فقرہ رہ رہ کر یاد آیا— ''یا تو موت مجھ پہ پھٹ پڑے گی یا میں موت پہ پھٹ پڑوں گا۔'' موت پہ پھٹ پڑنے والے آج بھی موجود تھے۔ بس میں انھیں پہچان نہیں سکا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ میرے اردگرد بے حس اور بزدل لوگوں کا ہجوم ہے مگر اس وقت جب موت دلّی پہ پھٹ پڑی تھی، ایک شخص چپ چاپ میری آنکھوں کے سامنے اٹھا اور موت پہ پھٹ پڑا۔ شیر و موت پہ پھٹ پڑا

اور کالے خاں گولنداز بن گیا۔ پھر ایک شخص میرے برابر سے اٹھا اور اس نے موت کو جا لیا۔ موت کو پچھاڑنے والے موت کو یوں پچھاڑ دیتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ عمر بھر موت کو پچھاڑنے کے لئے خم ٹھونکتا رہا اور اب خود میرے پچھڑنے کی نوبت آ گئی ہے۔

۱۹/ جنوری

آج میں دن بھر منھ لپیٹے پڑا رہا۔ ایک دو مرتبہ میں نے ارادہ بھی کیا کہ ذرا اٹھوں اور باہر گھوم آؤں۔ مگر گھومنا تو درکنار اب تو چارپائی سے اٹھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی نقاہت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ جسم کی نقاہت تو ہرگز نہیں ہے۔ بس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جذباتی طور پر تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ کچھ عجب عالم ہو گیا ہے۔ اب میں شدت سے کوئی بات محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ کل کالے خاں کی موت کی خبر سنی۔ یہ موت بھی دراصل اتنی ہی چونکانے والی تھی جتنی شیرو کی موت چونکانے والی تھی۔ مگر میں اسے اس شدت سے محسوس ہی نہیں کر سکا۔ دراصل ہر ہنگامے کی تان بالآخر جمود ہی پر ٹوٹتی ہے۔ میں نے جیسی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے اس کا انجام بہر صورت یہی ہونا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی اس شکست کا افسوس نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں اتنے ہنگامے کے باوجود موت سے ٹکر نہیں لے سکا۔ موت سے جیتتا تو خیر کون ہے۔ شیرو اور کالے خاں بھی اپنے طنطنہ کے باوجود موت سے پچھڑ گئے۔ مگر انھوں نے موت کے دانت ضرور کھٹے کر دیے۔ کچھ اسی شان سے میں بھی موت سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ وقت گزر گیا اور اب میرے جسم میں میری روح میں ایک تھکن سرایت کرتی جا رہی ہے۔

۲۰/ جنوری

آج صبح مجھ پہ عجب واردات گزری۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں

کہ سبطین چپ چاپ افسردہ سی صورت بنائے کسی سوچ میں گم ہے۔ پورے کمرے کی فضا میں اداسی رچی ہوئی تھی۔ یہ وہی کمرہ ہے جہاں مزمل اور اجمل دن رات اخبار پہ جتے رہتے تھے اور جہاں بیٹھ کر سبطین کے تخیل اور زبان دونوں کو پر لگ جاتے تھے۔ کمرے کی اس اداس فضا نے مجھ پہ عجب اثر کیا۔ میرا دل بھر آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ کچھ بہت ہی عجیب ہی بات تھی۔ مگر آج کل تو مجھے روز کسی نہ کسی ایسے تجربے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو میری فطرت کے خلاف ہے یا کم از کم جسے میں اپنی فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ رونے کو ہمیشہ میں نے اپنی فطرت کے خلاف سمجھا۔ یہ کام میں نے سبطین کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ دراصل رونا نرم گرم طبیعتوں کا مشغلہ ہے۔ سبطین فطرتاً نرم مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے زمانے سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ جس صورتِ حال کو وہ تین مہینے پہلے ناقابل برداشت تصور کرتا ہے، تین مہینے بعد وہ اس کے لئے قابل قبول بن جاتی ہے۔ اپنی ہر ناکامی میں وہ کوئی تسکین کا پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ تحریک کا بالکل پٹرا ہو چکا ہے۔ اخبار بند ہو گیا۔ کارکن رخصت ہو گئے۔ آج سبطین سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تین ماہ بعد وہ اس ناکامی کا جواز ڈھونڈھ لے گا اور خود فریبی کے لئے پھر سامان پیدا کرے گا۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ میں حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہ حالات کا اثر ہے کہ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ورنہ یہ میری سب سے بڑی طاقت بھی ہو سکتی تھی۔

۲۲ر جنوری

آج میں نے پھر اپنے آپ کو رونے پہ مائل پایا اور بغیر کسی وجہ کے بس یونہی جی چاہا کہ خوب رووٴں، پھوٹ پھوٹ کر رووٴں۔ میں سوچتا ہوں کہ یا اللہ کیا میرے

مزاج کی کایا پلٹ جائے گی۔ میری طبیعت میں یہ سوز و گداز آخر کیسے پیدا ہوا۔ کیا واقعی ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ رونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اتنا تو میں مانتا ہوں کہ بعض لوگوں کی افتاد کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ رونے سے ان کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ ان کی روح کی کدورت دھل جاتی ہے۔ مگر ان لوگوں کی طبیعتوں میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ ہوتی ہے۔ میری طبیعت میں وہ گھلاوٹ نہیں ہے۔ میرے سینے پہ جو ایک بوجھ ہے، وہ یوں نہیں ہٹے گا۔ وہ آنسوؤں سے نہیں دھل سکتا۔ مگر یہ غبار کیسے دھلے گا، یہ میں نہیں جانتا۔ میری روح میں جو ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا، اب اس نے مضمحل ہو کر ایک رینگتے ہوئے غبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ غبار آنکھوں کی راہ نہیں نکلے گا۔ اس کے نکاس کی جو راہ ہے، وہ یا تو میرے بس میں نہیں ہے یا میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

۲۳/ جنوری

رات مجھے بے تحاشہ افسری کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کچھ بہت افسردہ ہو گئی۔ افسری کا جو ب خیال آتا ہے تو بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے کوئی چٹکی لے رہا ہے۔ نہ جانے یہ کیا کیفیت ہے۔ یہ محبت کی کیفیت تو یقیناً نہیں ہے مگر اس میں اپنی ناکامی کا احساس ضرور چھپا ہوا ہے۔ یہ بھی آخر مغالطہ ہی نکلا کہ میں عورت کو شکست دے سکتا ہوں۔ مجھے دنیا کی ہر کمزور طاقت نے شکست دی۔ عورت بھی دنیا کی ایک کمزور طاقت ہے۔

افسری یوں جو کچھ بھی ہو مگر اس کے جسم کو دیکھ کر تو بس سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس جسم کے آگے میں نہ تو خود جھک سکا اور نہ اسے اپنے آگے جھکا سکا۔ دراصل محبت سپردگی کا معاملہ ہے۔ وہ چیز نہ مجھ میں تھی، نہ افسری میں تھی۔ یوں میں

جانتا ہوں کہ اسے حق سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

افسری کے متعلق جب میں سوچتا ہوں تو دل کو کوئی مسلنے لگتا ہے اور کوئی چپکے چپکے افسردگی آمیز آواز میں کہتا ہے، ''زندگی ضائع ہوگئی۔ وقت بیت گیا۔'' زندگی واقعی ضائع ہوگئی۔ وقت بے شک بیت گیا۔

۲۶/ جنوری

رفتہ رفتہ میری طبیعت ٹھکانے آ رہی ہے۔ میری طبیعت میں جو رقت کا مادہ پیدا ہو چلا تھا، اس پہ میں نے قابو پالیا ہے۔ یوں اب بلا وجہ، بلا سبب بیٹھے بٹھائے میرا دل بھر کر نہیں آتا۔ لیکن اب دوسری کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا دل پتھر کا ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل میں نت نئی کیفیتوں سے گزر رہا ہوں۔ یہ کیفیتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔ اللہ جانے مجھے کیا ہوا جا رہا ہے۔

۲۷/ جنوری

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
گویا کوئی نگر ہو کسو کا لٹا ہوا

۲۸/ جنوری

سینے پہ ایک مٹیالا بوجھ سا رکھا ہے۔ اس کے اثر سے دم بند ہوا جا رہا ہے، اور یوں معلوم ہو رہا ہے کہ دل کی نبض ڈوبتی جا رہی ہے۔

۲۹/ جنوری

آج ۲۹ جنوری ہے۔ جب مجھے تاریخ یاد آ جاتی ہے تو اطمینان سا ہوتا ہے کہ ابھی وقت کا احساس مجھ میں باقی ہے۔ مگر یہ احساس آخر کب تک باقی رہے گا۔ ذہن کی عجب کیفیت ہے۔ ایک دھندسا اس میں بھرا ہوا ہے بلکہ مجھے تو ساری چیزیں ہی

گرد میں اَٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کا الگ الگ وجود میرے لئے ختم ہو چلا ہے۔ بس یوں لگتا ہے کہ ذروں کا ایک جلوس ہے جو ڈھیرے ڈھیرے چیزوں کو اپنی آغوش میں لے رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔

۳۰ / جنوری

نامے میں لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میرؔ بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

حاضر کا احساس باقی ہے، دھندلا دھندلا ہی سہی۔ مگر ماضی کی کڑیاں بالکل گم ہو چکی ہیں۔ آج میں نے اپنی ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی تا کہ کچھ اپنی گزری ہوئی زندگی کا اتا پتا ملے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ اتنے بہت سے لفظ کہاں سے آئے؟ کس نے لکھے ہیں؟ میں نے لکھے؟ رونا تو میری فطرت کے خلاف ہے اور ان لفظوں میں جا بجا لہو رونے کے نشان ملتے ہیں... نہ رونے والے کیسے کیسے عجیب طریقوں سے روتے ہیں اور کتنے غیر محسوس ڈھنگوں سے روتے ہیں۔ لہو رونا اور خط کھینچنا، کیا میں عمر بھر یہی کرتا رہا ہوں۔ مگر یہ کیا طور... میں کہنا کیا چاہتا ہوں... چیزیں آپس میں گڈ مڈ ہو رہی ہیں۔ یہ ٹیڑھے میڑھے خط، یہ میری ڈائری کے الٹے سیدھے لفظ پگھل رہے ہیں۔ آپس میں خلط ملط ہو رہے ہیں... لہو روتے ہوئے مرتعش لفظوں کی قطار دھندلی پڑ رہی ہے، مٹ رہی ہے...؟؟

کچھ یاد نہیں پڑتا کہ آج کیا تاریخ ہے اور کون سا مہینہ ہے۔ ممکن ہے آج کوئی تاریخ نہ ہو اور کوئی مہینہ نہ ہو۔ وقت ختم ہو گیا ہے یا میں اس کے احساس سے محروم ہو گیا ہوں؟ اپنے اردگرد مجھے ایک مٹیالا غبار منڈلاتا نظر آتا ہے۔ اس مٹیالے غبار میں مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے کہ گائے کے دو سینگ معلق ہیں اور ابھی ابھی

کوئی مدوری چیز جو ان پہ ٹکی ہوئی تھی، یکا یک غائب ہو گئی ہے۔

وہ تھکن جو میرے جسم اور میری روح میں رچ گئی تھی، اس کا احساس زائل ہو چلا ہے۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا جسم پتھر کا ہوتا جا رہا ہے۔ بھورے بھورے، ڈراؤنی صورتوں والے بندر مجھ پہ لپک رہے ہیں اور میں انھیں چپ چاپ دیکھ رہا ہوں۔ میری مدافعت کی قوت زائل ہو چکی ہے۔ میرے دھڑ تک کا جسم پتھر کا ہو چکا ہے اور جمود کی کیفیت دھیرے دھیرے اوپر کی طرف بڑھ رہی ہے اور میرے نڈھال ہوتے ہوئے دل کو چھو لینا چاہتی ہے۔ کچھ گہن کی سی کیفیت ہے... گہن؟... چاند کو گہن لگ رہا ہے۔ چپ چاپ دھیرے دھیرے... میں گہنا رہا ہوں، یعنی فیاض خاں گہنا رہا ہے... اس کی روح گہنا رہی ہے...

ختم شد

انتظار حسین
Intezar Hussain
Chand-Gahan
arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 978-93-81029-40-4
9789381029404
A for Arshia Publications